درد کا صحرا

تقسیم برصغیر کے دوران چند افراد کی داستان

درد کا صحرا

تقسیمِ برصغیر کے دوران چند افراد کی داستان

ایڈیٹر: انیس جیلانی

ترجمہ: کوکب جہاں

پی او بکس 301، اسلام آباد، پاکستان
ٹیلی فیکس: +92-51-2279256

فہرست

درد کا صحرا

پیش لفظ

1947 میں انڈیا کی تقسیم ایک ایسی جراحی تھی جس میں عمل جراحت سے پہلے سُن کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی گئی۔ وہ لوگ جو خوش قسمتی سے ذاتی المیوں سے بچ گئے دھوم دھام سے آزادی کا جشن منانے میں مگن ہو گئے لیکن اس جشن کی قیمت لاکھوں لوگوں نے پاک و ہند سرحد کے دونوں طرف اپنے جسم و جاں کی قربانی دے کر چکائی۔

جب تک یہ ہولناک واقعات ہماری یاداشت میں زندہ ہیں اور افسانوں اور داستانوں کی زینت نہیں بن جاتے ہمیں ان کو تمام تر خونیں تفصیل کے ساتھ بار بار دہرانا چاہیے تاکہ ایک دن ہم اجتماعی عزم کے ساتھ یہ کہہ سکیں کہ ایسا دوبارہ کبھی نہیں ہوگا۔

معصوم انسانوں کے مصائب کا معاملہ ہو تو مذہب، نسل یا علاقائی امتیاز کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ حقیقتاً لاکھوں مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں نے تقسیم ہند کے دوران ایسے ہی عذاب کا سامنا کیا تھا جس کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ یہ سچے قصے جو آپ اس کے صفحات میں پڑھیں گے، اپنے محدود دائرہ نگاہ کے باوجود کسی علیحدہ اور خصوصی حیثیت کا دعویٰ نہیں رکھتے۔ تمام گروہوں کے مجموعی مصائب کے سامنے ایک فرد کی دہشت یقیناً کم ہو جاتی ہے۔ یہ واقعات جو یہاں بیان کیے گئے ہیں ایک بہت بڑی تاریخی حقیقت کا حصہ ہیں جو دنیا کی توجہ سے محروم رہی ہے۔

ہم نے دانستہ طور پر یہ کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں تینوں مذہبی گروہوں کے تناظرات کو جگہ دی جائے۔ پاکستان میں ہمیں ہندوؤں اور سکھوں کے ان المیوں کا علم نہیں ہوتا جن کا سامنا ان لوگوں نے ہمارے حصے کے پنجاب میں کیا۔ اس لحاظ سے یہ انڈیا اور پاکستان کے درمیان موجود ابلاغ کی خلیج کو پاٹنے کی ایک کوشش کی ہے۔ ہم اس کوشش میں کتنے کامیاب ہوئے ہیں اس بات کا فیصلہ قارئین کو کرنا ہے۔

امید ہے کہ قارئین اس کتاب کی اس خصوصیت کو سراہیں گے کہ اس میں تقسیم کے سیاسی پہلوؤں کو بالکل ہاتھ نہیں لگایا گیا۔ اولاً اس لئے کہ یہ اس کتاب کے موضوع سے باہر ہیں، دوئم اس لئے کہ متعلقہ ممالک میں اس موضوع پر پہلے ہی ڈھیروں تحریریں دستیاب ہیں اور آخری بات یہ کہ انڈیا اور پاکستان کے لوگ پہلے ہی تقسیم کی بنیادوں کے بارے میں اپنا اپنا واضح نکتہ نظر رکھتے ہیں اور اس واقعے کی اپنے اپنے نکتہ نظر کے مطابق تشریح بھی کرتے ہیں۔ اس لئے اب اس رویے پر اثر انداز ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تقسیم ایک امر واقعہ ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اب لوگوں کو ان مظالم کا احساس ہو جائے جو 1947 میں ڈھائے گئے اور یہ عزم کریں کہ دوبارہ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔

کوئی چیز انسانی حقوق سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ ستیش گجرال نے اپنے مضمون میں کہا ہے۔ دردمندی ہی انسانوں کو جانوروں سے ممیز کرتی ہے۔ اگر ہم نے اس دردمندی کو کھو دیا تو انسان اور حیوان کا فرق مٹ جائے گا۔ انڈیا اور پاکستان کی جو تاریخ ہمیں ملتی ہے وہ متعصبانہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس وجہ سے ہم اس حقیقت کا ادراک کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب کبھی ہمارے ملکوں میں کسی قسم کے فسادات ہوتے ہیں، خواہ وہ انڈیا میں ہندو مسلم فسادات ہوں یا پاکستان میں صوبہ سندھ میں پٹھان سندھی اور مہاجر فسادات ہوں یا پھر شیعہ سنی فسادات، تقسیم کے زمانے میں ہونے والے المیے ہر بار پہلے سے کہیں زیادہ خوفناک انداز میں دہرائے جاتے ہیں۔ بجائے اس سے سبق سیکھنے کے ہم دن بدن دردمندی سے محروم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

پیش لفظ

یہ کتاب ہم نے پہلے انگریزی میں Surgery without Anesthesia : Partition of India کے عنوان سے شائع کی تھی۔ اس کی خاصی پذیرائی ہوئی اور قابل ذکر امر یہ ہے کہ کسی نے ہم پر یہ کتاب شائع کرنے پر تنقید نہیں کی۔ تاہم یہ محسوس کیا گیا کہ اس کتاب کے پیغام کو اردو پڑھنے والوں تک پہنچانا اور بھی ضروری ہے اور موجودہ کوشش اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

میں ترجمہ کے سلسلے میں کوکب جہاں کا بہت شکرگذار ہوں کہ انہوں نے نہایت معیاری ترجمہ کیا۔ میں جناب حفیظ الرحمٰن کا بھی بہت مشکور ہوں کہ انہوں نے ہمیشہ کی طرح ہماری اس کوشش کی بھی ہر مقام پر بشمول اخبارات میں بے حد تعریف کی اور ہماری حوصلہ افزائی کی۔ وہ ہر ملاقات میں ہم سے اردو ترجمے کی بابت پوچھتے تھے۔ ہم صاحب اقتدار صاحبان میں سے نہ ہیں نہ ہمارے پاس کوئی طاقت ہے۔ چنانچہ موجودہ پاکستانی معاشرہ میں حفیظ الرحمٰن جیسے اشخاص اب چند ہی موجود ہیں جو بغیر کسی غرض کے صرف انسانی بنیادوں پر حوصلہ افزائی جاری رکھیں!

انیس جیلانی

13 جون 2002

اسلام آباد

تعارف

ضیاء الحق نامی ایک صاحب چالیس برس سے بھی زیادہ مدت کے بعد دوبارہ دہلی جارہے تھے۔ انہوں نے دہلی میں انڈین ملٹری سروسز کے اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں کام کیا تھا اور انہیں یہ دیکھ کر پرمسرت حیرانی ہورہی تھی کہ ان کے دفتر کے بہت سے پرانے ساتھی ہوائی اڈے پر ان کا استقبال کرنے کے لئے موجود تھے۔ مگر ان کے بہترین دوستوں میں سے موہن وہاں موجود نہ تھا۔ ضیاء کے دوستوں نے انہیں بتایا کہ موہن اپنے گھر پر ان کا انتظار کر رہا ہے جہاں اس کی بیٹی کی میت رکھی ہے۔ وہ ایک دن پہلے فوت ہوگئی تھی مگر موہن اس کی چتا جلانے سے انکار کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ضیاء اس کے پورے خاندان سے ملیں اور اس کا خاندان اس بیٹی کے بغیر مکمل نہیں تھا۔ ضیاء ہوائی اڈے سے سیدھے موہن کے گھر گئے اور اپنے دوست کی بیٹی کی آخری رسومات میں شرکت کی۔ ضیاء الحق کو ایک ہندو خاندان سے اس قدر پیار ملا، مگر کیا اس طرح کی اپنائیت اور جذبے کسی نہ کسی انداز میں سب دلوں میں نہیں پائے جاتے؟

یہ دو قومیں برصغیر میں صدیوں سے مل جل کر رہ رہی تھیں۔ مگر جب تقسیم کے دنوں کے واقعات رونما ہوئے تو 70 لاکھ مسلمان انڈیا سے پاکستان کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے اور تقریباً اتنی ہی تعداد میں غیر مسلموں نے دوسری طرف ہجرت کی۔ یہ بیسویں صدی میں جبری ہجرت کا سب سے بڑا واقعہ ہے جس میں ایک ہی وقت میں اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ اس کے حجم کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آزادی سے پہلے لاہور کی کل آبادی 12 لاکھ تھی جس میں لگ بھگ 5 لاکھ ہندو اور ایک لاکھ سکھ شامل تھے۔ جب فسادات کا غبار تھما تو پتا چلا کہ لاہور میں ہندو اور سکھ مذہب کے کل ایک ہزار افراد باقی رہ گئے ہیں۔ ایک اور مثال یوں ہے کہ مغربی پاکستان کے تمام

علاقوں میں ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد کل آبادی کا 18.4 فیصد تھی مگر جب 1951 کی مردم شماری کی نوبت آئی تو یہ تناسب 1.6 فیصد رہ گیا تھا۔ ایک تحقیق کے مطابق مغربی پاکستان سے 50 لاکھ سکھ اور ہندو چلے گئے اور تقسیم کی وجہ سے تقریباً 60 لاکھ مسلمان یہاں آ گئے، جبکہ مشرقی پاکستان سے 20 لاکھ ہندو چلے گئے اور 5 لاکھ مسلمان وہاں آ گئے۔ سب سے زیادہ آبادی کا اخراج صوبہ پنجاب سے ہوا۔ یہاں ہندو آبادی 1941 میں 20.5 فیصد تھی جبکہ 1951 میں یہ تعداد 0.2 فیصد رہ گئی تھی۔ سندھ نسبتاً پرسکون رہا۔ 1941 میں اس صوبے میں بسنے والے ہندوؤں کی تعداد 1,109,000 تھی اور 1951 تک اس میں سے 464,000 ہندو رہائش پذیر تھے۔ البتہ کراچی میں ہندوؤں کی تعداد میں شدید کمی آئی۔ یہاں ہندو کل آبادی کا 46.9 فیصد تھے بعد میں یہ گھٹ کر 1.6 فیصد رہ گئے۔ مشرقی پاکستان میں ہندو آبادی کا تناسب 28 فیصد سے کم ہو کر 22 فیصد رہ گیا۔

ہمیں اس المناک ہجرت سے متعلق واقعات پڑھنے اور سننے کا موقعہ نہیں ملتا۔ ہر سال جب دونوں ملکوں کے یوم آزادی منائے جاتے ہیں تو ہمیں وہ سیاسی واقعات پڑھنے اور سننے کو ملتے ہیں جن کے نتیجے میں انگریزوں نے ہندوستان سے اقتدار چھوڑا اور قیام پاکستان پر رضا مند ہوئے لیکن ہم شاذونادر ہی ان مظالم کے بارے میں سنتے ہیں جو دونوں طرف ڈھائے گئے۔ جب ہمارے نوآبادیاتی آقاؤں نے تقسیم ہند کا فیصلہ کر لیا تو اگلا اہم ترین معاملہ خطِ تقسیم کا تھا۔ 3 جون 1947 کو جس منصوبے کا اعلان کیا گیا اس کی بنیاد اس قیاس پر تھی کہ پنجاب اور بنگال کے باہم ملحق ضلعے جن میں مسلم آبادی کی اکثریت ہے پاکستان کو ملیں گے اور اس کے نتیجے کے طور پر بنگال اور پنجاب میں سب سے فیصلہ کن تقسیم عمل میں آئی۔ اس کام کے لئے ایک برطانوی جج یعنی سائرل ریڈکلف کو مامور کیا گیا جو لاکھوں خاندانوں کے لئے تباہی کا پیغام لایا۔ بنگال میں کلکتہ کو مشرقی پاکستان سے الگ کر دیا گیا۔

پنجاب سب سے زیادہ زرخیز اور خوشحال علاقوں میں سے ایک تھا اور جہاں مسلمانوں (55 فیصد) اور ہندوؤ (30 فیصد) کے علاوہ سکھوں کی خاصی بڑی تعداد رہتی تھی۔ اس صوبے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مخاصمت پہلے ہی نفرت کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ جب 13 اگست کو ریڈ کلف ایوارڈ کا اعلان ہوا تو اس علاقے کی تاریخ کا سب سے بڑا قتل عام شروع ہو گیا۔ مغرب کی طرف فرار ہوتے ہوئے مسلمانوں کو ان کے کاروان اور کھچا کھچ بھری ریل گاڑیاں روک کے سکھ اور ہندو جتھوں نے قتل عام کا نشانہ بنایا اور مشرق کی طرف بھاگتے ہندوؤں اور سکھوں کو بھی ایسے ہی انجام کا سامنا کرنا پڑا۔ جو مسلح فوج امن وامان بحال کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے وہ نہ صرف تعداد میں کم تھے بلکہ بعض اوقات تو وہ خود اس متعصبانہ قتل عام میں شریک ہونے کے لئے تیار تھے۔ پنجاب میں جب فسادات تھمے تو ایک کروڑ چالیس لاکھ افراد سرحدیں عبور کر چکے تھے اور بے حد محتاط اندازوں کے مطابق 250,000 افراد قتل عام کی بھینٹ چڑھ چکے تھے اصل تعداد شائد پانچ لاکھ سے بھی اوپر ہو گی۔ وسیع پیمانے کی یہ بربادی عوام کے سروں پر تھوپ دی گئی تھی۔ نسلوں سے رہتے بستے لوگوں میں سے شاید ہی کسی نے اپنے آبائی وطن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے کا سوچا تھا۔ بہت سے لوگوں نے اپنے مکانوں اور دکانوں کی چابیاں دوسرے مذہب سے تعلق رکھنے والے اپنے دوستوں کو صرف اس امید پر دے دی تھیں کہ جب فرقہ وارانہ فسادات کا جوش ٹھنڈا ہو جائے گا تو وہ جلد ہی واپس آ جائیں گے۔ کشت وخون اس قدر اچانک اور اتنا شدید تھا کہ بہت سے لوگوں کو سر چھپانے کی جگہ بھی نہ ملی ان کے پاس صرف یہی راستہ باقی تھا کہ وہ ان نئی سرزمینوں کی طرف رخ کریں جہاں ان کے ہم مذہب لوگوں کی اکثریت آباد ہے۔

تقسیم یا اذیت ناک جراحی پر یہ کتاب ہمارے لیے خود اپنی بے رحمانہ تواریخ سے نقاب ہٹانے کی ایک کوشش ہے۔ وہ قتل وغارت جو تقسیم کے نتیجے میں برپا ہوا قتل عام کے بارے میں لکھے جانے والے ادب میں خاص مقام رکھتا ہے۔ تعصب کے جذبات سے بھرپور قتل وغارت کے اس زیادہ واضع مظہر کا تصور بھی ممکن نہیں کہ ایک مسلمان عورت کے جسم پر پاکستان زندہ باد گود دیا گیا۔ یہ کتاب ہمارے

سامنے یہ سوال اٹھاتی ہے کہ ہم اس تقریباً مکمل نسلی صفائے کے بارے میں کیا تصور قائم کریں جو پنجاب میں ظہور پذیر ہوا جبکہ بنگال میں بہت سے ہندو اور مسلمان تقسیم کے دوران اور اس کے بعد بھی مل جل کر رہتے رہے یا جنوبی ہندوستان کے بارے میں جہاں تقسیم سے کوئی ہیجان نہیں پھیلا بلکہ لکھنو کی مثال بھی موجود ہے جہاں آج تک کوئی بڑا فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔

عورتیں، جو تقسیم کے پر تشدد ہنگاموں میں ہندو اور مسلمان مذہبی گروہوں کی علامت اور متبادل بن گئیں، اجتماعی خودکشی پر مجبور ہوئیں، ان کی چھاتیاں، ہاتھ اور پاؤں کاٹے گئے، ان کی عصمتیں لوٹی گئیں اور انہیں اغوا کیا گیا۔ ان میں سے لاکھوں لاپتہ ہو گئیں، بہت سی عصمت دری کے نتیجے میں حاملہ ہو گئیں اور بہت سی ایسی تھیں جنہیں مذہب تبدیل کرنے اور مخالف مذہب کے افراد سے شادی کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ بہت سی قحبہ خانوں کی نذر ہو گئیں۔ ایسی خوش قسمت بہت ہی کم تھیں جو واپس سرحد پار اپنے خاندانوں تک پہنچ سکیں۔ اور پھر واپسی پر انہیں کس صورتحال کا سامنا کرنا پڑا؟ ایسی لڑکیوں کی وطن واپسی کا انتظام کرنے والی ایک عورت سے مخالف علاقے میں پھنسی ہوئی لڑکیوں کے ایک گروہ نے تلخی سے پوچھا تم کون ہوتی ہو ہمارے بارے میں فیصلہ کرنے والی؟ ان تمام عورتوں میں سے انڈیا میں کل 50,000 مسلمان عورتیں اور پاکستان میں 33,000 ہندو اور سکھ عورتیں تلاش کر کے بازیاب کی گئیں باقی تمام تاریخ میں گم ہو گئیں۔ ہم سب تقسیم کے دوران ہونے والے قتل و غارت سے لوگوں کو پہنچنے والے صدمات کا تصور تو کر سکتے ہیں لیکن ہر فرد کے انفرادی رنج اور دکھ کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ ہم اس بھائی کی اذیت کو کیا محسوس کر سکتے ہیں جس کے سامنے اس کی چھوٹی بہنوں کی عصمت دری کی گئی اور وہ جان بچانے کے لئے چھپا ہو؟ ہم اس ماں کے دکھ کو کیسے سمجھ سکتے ہیں جس کی بیٹی کو اس کے سامنے اغواء کیا گیا ہو اور پھر اسے اس بیٹی کی تمام عمر کوئی خبر نہ ملی ہو؟ ہم اس باپ کے کرب کو کیا نام دیں گے جو اب اپنے خاندان کا واحد نام لیوا ہے کیونکہ اس کا سارا خاندان اس کے سامنے ذبح کر دیا گیا؟ ہم اس ہندو خاندان کی اذیت کا بیان کیسے کر سکتے ہیں جس نے دہلی میں اپنے گھر میں پناہ لینے والے ایک مسلمان کو چند گھنٹوں بعد محفوظ سمجھتے ہوئے چلے جانے کو کہا اور ذرا ہی دیر بعد وہ جان لیوا زخموں سے چور ان کی دہلیز پر پڑا تھا؟

ستیش گجرال کہتے ہیں کہ ہمدردی ہی وہ جذبہ ہے جو انسانوں کو جانوروں سے ممتاز کرتا ہے۔ وہ کون لوگ تھے جو دونوں طرف لاکھوں انسانوں کا خون بہارہے تھے؟ کیا ایسے مکروہ جرائم کے بعد ہم ان سے کسی ہمدردی کی توقع کر سکتے تھے؟ جب ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں ایسے قاتل اور عصمت دری کے مجرم کھلے عام پھر رہے تھے تو ہم کن معجزوں کی توقع کر سکتے تھے؟ کسی کو مکہ مارنے یا دھمکی دینے کے جرم میں تو ایک فرد کو جیل جانا پڑ جاتا ہے لیکن ان غارت گروں نے لاکھوں کو قتل کیا اور ہزاروں کی عصمتیں لٹیں لیکن کسی نے کبھی آواز بلند نہ کی کہ ان قاتلوں، غارت گروں اور عصمت دری کے مجرموں کے خلاف مقدمات چلائے جائیں اور انہیں سزائیں دی جائیں۔ بھلا کیوں؟ کیا تقسیم کے موقعے پر قانونی طور پر یہ جائز اور انسانی افعال تھے؟ کیا قتل، عصمت دری، لوٹ مار یا آتش زنی جس کا نشانہ معصوم اور نہتے لوگ بنے، اس وقت جائز ہو جاتی ہے جب کسی کے ہم مذہبوں کے ساتھ سرحد پار ایسے واقعات ہو رہے ہوں؟

ان قاتلوں اور عصمت دری کے مجرموں پر مقدمہ چلانے کے لئے پورے برصغیر میں ایک بھی آواز نہ اٹھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں مسلسل مذہبی فسادات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ 1971 میں مشرقی پاکستان میں بنگالیوں کا قتل عام ہوا اور عصمت دری جیسے گھناؤنے جرائم کیے گئے۔ 1984 میں اندرا گاندھی کو ہلاک کیے جانے کے بعد دہلی میں سکھوں کا قتل عام ہوا، 1992 میں بابری مسجد کے ڈھائے جانے کے بعد مسلمانوں کو قتل و غارت کا سامنا کرنا پڑا اور سندھ میں مہاجر، پختون اور سندھی لوگوں کے درمیان خونریز فسادات ہوئے۔

تقسیم یا اذیت ناک جراحی؟ ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبانی بیان کیے گئے تاریخی واقعات پر مشتمل ہے۔ اس میں اس غلام حسین کا ذکر ہے جو چند مقامی لوگوں کے ساتھ اپنے گاؤں سے گزر رہا تھا کہ ان کا سامنا ایک ہندو لڑکی سے ہوا، اس لڑکی نے بہت التجائیں کیں کہ اسے قتل نہ کیا جائے اور اپنی زندگی بچانے کے آخری کوشش کے طور پر اس نے اپنا جسم بھی پیش کر دیا۔ غلام حسین نے اپنے ساتھیوں سے

اس کی جان بخش دینے کے لئے بہت درخواستیں کیں لیکن انہوں نے درانتی سے لڑکی کا گلا کاٹ دیا۔
اس کے بعد غلام حسین نے کبھی پاکستان کو پاک لوگوں کی سرزمین نہ سمجھا۔

یہ کتاب ستیش گجرال کا تذکرہ بیان کرتی ہے جنہوں نے امرتسر میں مسلمان لڑکیوں کے ایک ہوسٹل پر حملہ ہوتے دیکھا۔ ان لڑکیوں کو بالکل برہنہ حالت میں جلوس کی شکل میں شہر کے بڑے بازار میں پھرایا گیا۔ وہاں ان کی اجتماعی عصمت دری کی گئی اور ان کے ساتھ وہ انسانیت سوز اور شرمناک سلوک کیا گیا جس کا تصور انتہائی اذیت پسند ذہن ہی کر سکتا تھا اور پھر انہیں قتل کر دیا گیا۔ اس شارع عام پر لوگوں کا ایک انبوہ کثیر موجود تھا جو یہ ہولناک تماشہ دیکھنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ اپنی گاڑی میں بیٹھے ہوئے ستیش گجرال نے ان لوگوں کے چہروں پر ہمدردی یا خوف کے تاثرات ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر انہیں ایسا کوئی تاثر نظر نہ آیا۔

اس کتاب میں آپ کو بی اے چوہدری کا تذکرہ ملے گا جس نے کسی کو دبے پاؤں اپنے پیچھے آتا محسوس کیا۔ رک کر دیکھا تو سامنے ایک 18 سالہ نوجوان لڑکی اپنے ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی پوٹلی لیے کھڑی تھی۔ لڑکی نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''سلام صاحب جی، مجھے اپنے ساتھ لے چلیں''۔ ''کہاں''؟ اس نے پوچھا۔ لڑکی نے جواب دیا ''پاکستان، میرے خاندان کے تمام افراد سکھوں کے ہاتھوں قتل ہو چکے ہیں، صرف میں ہی زندہ بچی ہوں''۔ اس نے وہ چھوٹی سی پوٹلی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بتایا کہ اس میں اس کے خاندانی زیورات ہیں اور کہا کہ اگر اس کے پاس اس سے زیادہ کچھ ہوتا تو وہ بھی دے دیتی۔ اس تمام گفتگو کے دوران اس کی آنکھوں میں آنسو رواں تھے۔ اگلے دن جب چوہدری نے اس لڑکی کو اپنی پوٹلی دونوں ہاتھوں سے تھامے ایک شیشم کے درخت سے سر نکالے دیکھا تو اسے اپنے ٹرک کی طرف بلایا اور وہ دوڑی آئی۔ جب ٹرک اپنی منزل پر پہنچا اور عورتوں نے روٹی پکانی شروع کی تو لڑکی نے پہلی روٹی چوہدری کو پیش کی۔ یہ ایک انداز تھا اس قرض کی ادائیگی کا جو وہ اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی۔

یہ کتاب آپ کو صوبیدار دیوان پال سنگھ بھاسن ''دیوانہ'' کے خاندان کے بارے میں بتائے گی جو راولپنڈی کے نزدیک تھاملی کے مقام پر رہتا تھا۔ جب فسادیوں نے ان کے مکان کو گھیر لیا اور عورتوں کو یقین ہو گیا کہ انہیں عصمت دری، اغوا اور قتل کا سامنا ہو گا تو وہ اپنے لیے اور اپنی کم سن بچیوں کے لیے مرنے کے طریقے کا سوچنے لگیں۔ ان کے پاس دو صورتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ مقامی سکھ قصائی کو، جو اپنے مددگاد کے ساتھ تیار کھڑا تھا، بلوایا جائے اور باری باری سب کے سر کٹوا دیے جائیں۔ اور دوسری صورت یہ تھی کہ گوردوارے میں جا کر خود کو آگ لگا لی جائے۔ بھاسن کی بیوی اور لڑکیوں نے خود کو گوردوارے میں بند کر لیا اپنی دعائیں پڑھیں اور مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا لی۔ ذرا سی دیر میں آگ نے پوری عمارت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بھاسن کی تین چھوٹی بیٹیوں اندر، ہر بھجن اور سریندر نے گڑگڑا کر اپنی ماں سے التجائیں کیں کہ وہ یہ تکلیف برداشت نہیں کر سکتیں۔ آخر کار ماں نے پریشان ہو کر انہیں جلتی ہوئی عمارت سے باہر دھکیل دیا۔ مگر سب سے بڑی بیٹی پریتم کور نے اپنی ماں کے ساتھ جل مرنے کو ترجیح دی۔

صرف وہی لوگ جذبہ ہمدردی سے محروم نہیں ہوئے جنہوں نے تقسیم کے دوران ظلم و تشدد کیا بلکہ تقسیم کی اذیتوں نے ان تمام لوگوں پر اثر کیا جو ان واقعات کو دیکھ رہے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ، خوفناک مناظر ان کے اندر اس شدت کا احساسِ نفرت پیدا نہیں کرتے تھے جیسا کہ شروع میں ہوا کرتا تھا۔ وہ بتدریج بے حس ہوتے چلے گئے۔ کوئی بھی افتاد ان کے سوئے ہوئے احساسات کو جگا نہیں پاتی جو پتھر کی مانند بے حس ہو چکے ہیں۔

کیا ہم وحشی ہیں؟ کیا کسی بے گناہ مسلمان کا ہندو کے ہاتھوں یا کسی بے گناہ ہندو کا مسلمان کے ہاتھوں قتل ہمارے مذاہب کے احکامات کے مطابق ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے لوگوں کو ایک دوسرے سے مختلف تخلیق کیا (48 : 5)۔ وہ یہ بھی فرماتا ہے کہ دین کے بارے میں کوئی جبر نہیں ہے (2:256)۔ ہم دو یا دو سو قوموں میں بٹ سکتے ہیں مگر ہم انسان ہی رہیں گے۔ کیا خود زندگی سے بھی

قیمتی کوئی چیز ہے؟ ایک امید افزا چیز جو اس تقسیم کے ہنگاموں میں دکھائی دی وہ مخالف سمتوں کے مہاجرین کے قافلوں کا آمنا سامنا ہونے پر ایک دوسرے سے سلوک تھا۔ اگر چہ بعض ایسی مثالیں بھی ہیں کہ آمنا سامنا ہونے پر فساد اور قتل شروع ہو گیا مگر زیادہ تر ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں دونوں فریقوں نے اپنے مشترکہ مصائب پر ایک دوسرے سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ دونوں طرف سے ملنے والے قافلوں نے ایک دوسرے کو پانی پلایا اور دوسری ضروری اشیاء فراہم کیں۔ مگر سب سے زیادہ اہم بات وہ گہرا جذبہ مفاہمت ہے جس کا مظاہرہ انہوں نے کیا۔ کچھ ایسے خوش قسمت بھی تھے جنہیں ان کے مخالف مذہب والے ہمسایوں نے پناہ دی۔ انہی باتوں سے ہماری امید قائم ہے۔

اگر چہ یہ بات اصل موضوع سے ہٹ کر ہے لیکن حیرت ہے کہ پاکستان اور انڈیا نے لاکھوں لوگوں کے ورثے کو فراموش کر دیا ہے جو تقسیم کے وقت مارے گئے۔ باقی لوگوں کے لئے تو یہ آزادی کا موقع تھا مگر ان کے لئے موت کا دن تھا۔ ان کی یاد میں کوئی یادگار تعمیر نہیں کی گئی۔ پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائین، جو خود بھی مشرقی پنجاب سے تعلق رکھنے والے ایک مہاجر تھے، والٹن میں، جہاں پاکستان آنے والے پناہ گزینوں کا سب سے بڑا کیمپ تھا، ایک بہت بڑی یادگار بنانے کا منصوبہ تیار کر رہے تھے مگر اس منصوبے پر عمل درآمد ہونے سے پہلے وہ قتل ہو گئے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ پاکستان لاہور اور انڈیا دہلی میں ایک یادگار ان لوگوں کی یاد میں تعمیر کرائے جو مذہب کے نام پر اپنی جانوں سے محروم کر دیے گئے۔

—— انیس جیلانی

پرانے زخموں کے لئے مرہم

کچھ عرصہ پہلے میں نے چنڈی گڑھ میں ایک سکھ دوست کو ایک کتاب بھیجی جو اس کتاب کا انگریزی ایڈیشن تھا جو اب آپ کے سامنے ہے۔ یہ ایک غیر معمولی کتاب تھی اور اپنے موضوع کے اعتبار سے شاید یہ پاکستان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب تھی۔ کیونکہ اس قوم کو یہی پڑھایا اور سکھایا گیا ہے کہ اس ملک کی بقاء اور سلامتی اس بات سے مشروط ہے کہ یہاں کے لوگ انڈیا اور اس کے لوگوں کے خلاف کتنی نفرت محسوس کرتے ہیں۔

یہ کتاب گردیال سنگھ کو بھیجنے سے میرا مقصد صرف اسے یہ بتانا تھا کہ پاکستان میں بھی آفاقی انسانی اقدار پر یقین رکھنے والے اتنے ہی روشن خیال لوگ موجود ہیں جتنے انڈیا میں ہوں گے۔ گردیال اور میں چالیس کی دہائی کے شروع میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ میں انجینئر بننے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کرنے کے بعد وہاں جغرافیے میں ایم اے کر رہا تھا۔ ہم نے 49 برس کی جدائی کے بعد آپس میں رابطہ کیا، اس دوران میں ایک دو بار خط و کتابت کی کوشش کی جو بے کار گئی۔ اس لمبے عرصے نے ہمارے درمیان اپنائیت کو کم نہیں کیا۔

مسلمانوں کی مشرقی پنجاب سے اگست 1947 میں اور اس کے فوراً بعد پاکستان کی طرف ہجرت اور اسی زمانے میں سکھوں اور ہندوؤں کے پاکستان سے مشرقی پنجاب کی طرف انخلاء کو مورخوں نے تاریخ میں آبادی کی سب سے بڑی نقل مکانی قرار دیا ہے۔ یہ بات اسے اور بھی نمایاں بنا دیتی ہے کہ یہ نقل مکانی صرف دو ماہ کے قلیل عرصے میں ہوئی۔ یہ ایک عجوبہ ہے کہ دونوں ممالک کی حکومتیں بوجھ اور تناؤ سے بیٹھ نہیں گئیں۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ جو مسلمان پاکستان میں رہتے تھے اور ہندو اور سکھ

جو مشرقی پنجاب میں رہتے تھے، انہوں نے کھلے دل سے مہاجرین کو خوش آمدید کہا اور سماجی بہبود، صحت کی دیکھ بھال، لاکھوں لوگوں کو خوراک کی فراہمی اور بے گھر لوگوں کو ہر قسم کی ہمدردی اور دلجوئی مہیا کرنے میں بے مثال ثابت ہوئے۔

اس سارے قصے میں باعث شرم بات یہ تھی کہ یہی لوگ ایک دوسرے کے قاتل اور ایسے سفاک مظالم کرنے والے بھی ثابت ہوئے کہ اس کی بھی دنیا میں کوئی دوسری مثال نہیں ملے گی۔ یہ نسلی قتل عام۔۔ اسے نسلی قتل عام سے کم نہیں کہا جا سکتا۔۔ زیادہ تر قتل و غارت کے بارے میں پھیلنے والی، کبھی بے ساختہ اور کبھی سوچی سمجھی افواہوں اور غیر مصدقہ خبروں کا نتیجہ تھا۔ ان سے انتقام در انتقام اور جواب در جواب ردعمل کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس دور کی یادیں اتنی خوفناک ہیں کہ انہیں ہمیشہ کے لئے پیچھے چھوڑ دینا ہی بہتر ہو گا۔ لیکن ان مثالوں کو ضرور یاد رکھنا چاہیے جو اندھیرے میں روشنی کی کرن کی مانند ہیں، ایسی مثالوں کو جن میں دوسرے شخص کے مذہب کے بارے میں سوچے سمجھے بغیر انسان نے انسان کی مدد کی، انسانوں نے انسانوں کی جانیں بچائیں۔ یہ کتاب اسی بارے میں ہے۔ کاش کہ تقسیم کے بارے میں اور انسانیت کے فطری جزبے کے تحت اچھے کاموں کے ذریعے انسان کے اندر پائی جانے والی خوفناک درندگی کو کم کرنے کی کوششوں کے بارے میں کہانیوں کو اکٹھا کرنے کا یہ بھلا کام آج سے چالیس برس یا اس سے بھی پہلے کر لیا جاتا۔ ایسا سوچنے کی بہت سی معقول وجوہات ہیں۔ میں 1947 میں قریباً چوبیس سال کا تھا۔ میری عمر کے لوگوں کے لئے یہ کہانیاں بڑے گہرے معنی رکھتی ہیں کیونکہ ان میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں وہ ہماری ذات، ہماری نفسیات اور ہماری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کی تعمیر کے عمل کا حصہ ہیں۔ ہم ان واقعات میں سے گزرے ہیں۔ البتہ ہمارے بعد کی نسل کے لئے یہ واقعات ایسے ہی احساسات اور جذبات پیدا نہیں کریں گے۔ اسی لئے اس نسل کو ان سے روشناس کرانا ضروری ہے۔

بہر حال جیسا کہ کہا جاتا ہے دیر آید درست آید، لوگوں کو باشعور بنانے کا اچھا اور نیک کام دیر سے ہوا پر ہوا تو۔ ہمیں انیس جیلانی اور ان کے ساتھیوں کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے یہ غیر معمولی کتاب شائع کی۔

تقسیم کا ایک اہم پہلو مہاراجوں اور نوابوں کی ریاستوں کا مستقبل تھا۔ میں 1947 کے فیصلہ کن سال کے دوران جونا گڑھ میں تھا جہاں میں ریلوے کے محکمے میں کام کرتا تھا۔ اب یہ بات تقریباً بھلا دی گئی ہے کہ جونا گڑھ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان تنازعے کا باعث تھا کیونکہ وہاں کے نواب نے پاکستان سے الحاق کرنے کا فیصلہ کیا تھا باوجود اس کے کہ وہاں کی 80 فیصد آبادی ہندو تھی۔ اس لحاظ سے جونا گڑھ کا مسئلہ کشمیر جیسا ہی تھا کیونکہ وہاں کا حاکم ہندو اور آبادی مسلمان تھی اور جونا گڑھ میں

حاکم مسلمان تھا اور آبادی ہندو۔ مگر وہاں بحران اس سے بہت پہلے رونما ہوا جب کہ کشمیر ہندو مہاراجہ کے انڈیا کے ساتھ الحاق کے نتیجے میں میدانِ کارزار بنا۔

پاکستان اور جونا گڑھ کے درمیان کوئی مشترک سرحد نہیں تھی مگر ریاست کا ساحل خاصا طویل تھا اور کراچی تک سمندری سفر چند گھنٹوں کا تھا۔ مہاراجہ کشمیر اور نواب جونا گڑھ دونوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ ان کے عوام کا مذہب کیا ہے اور صرف اپنے اس قانونی اختیار پر انحصار کیا کہ وہ پاکستان یا انڈیا کسی بھی ملک کے ساتھ الحاق کر سکتے ہیں۔ یہ دونوں فیصلے خودغرضی کی بنیاد پر کیے گئے تھے۔

مجھے وہ دن یاد ہے جب میرا تعارف پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ سے کرایا گیا۔ ظفر اللہ خان جونا گڑھ کے نواب کو الحاق کے مسئلے پر مشورہ دینے کے لیے وہاں آئے ہوئے تھے۔ انہی کی اس یقین دہانی پر کہ ریاست کو پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کرنے کا پورا حق ہے، نواب نے یہ فیصلہ کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ فیصلہ بالکل جذباتی بنیادوں پر کیا گیا تھا۔ نواب کا خیال تھا کہ اگر وہ پاکستان میں شامل ہو گئے تو انہیں زیادہ اختیارات حاصل ہوں گے بہ نسبت اس کے کہ ان کی ریاست انڈیا کے ساتھ الحاق کرے۔ اس احساس کو مزید تقویت ملی جب انڈیا نے ریاست حیدر آباد پر چڑھائی کر دی، جس نے کسی بھی ریاست کے ماتحت ہونے کی بجائے آزاد ریاست کی حیثیت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور یہ بھی ریاست کا ایک قانونی اختیار تھا۔ چنانچہ ظفر اللہ جیسے سمجھدار اور دور اندیش انسان بھی جونا گڑھ کی ہندو آبادی کے جذبات کا احساس نہ کر پائے۔

جونہی نواب نے الحاق کی دستاویز پر دستخط کیے آس پاس کی ریاستوں میں ایک 'لبریشن آرمی' تیار کی گئی جو ظاہر ہے کہ انڈیا کی حکومت کی سرپرستی، اکسانے اور مالی مدد دینے پر تیار ہوئی اور سردار ولبھ بھائی پٹیل اسے ذاتی طور پر ہدایات دے رہے تھے۔ وہ انڈیا کے وزیر داخلہ اور وزیر برائے ریاستی امور تھے اور بڑے مضبوط عزم وارادے کے مالک تھے۔ انڈیا کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے بغیر کسی دشواری کے تمام ریاستیں حاصل کر لیں۔ (گو کشمیر کا مسئلہ آج بھی موجود ہے)

پٹیل کی جونا گڑھ میں دلچسپی کی ذاتی وجہ بھی تھی کیونکہ وہ گجراتی بولنے والوں میں سے تھے اور تقریباً اسی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ میں اگست کے مہینے میں اپنے گھر لاہور گیا ہوا تھا اور جب مہینے کے آخر تک میں واپس آیا تو جونا گڑھ ایک تعطل کا شکار تھا کیونکہ نواب نے ابھی تک الحاق کے مسئلے پر کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ جونہی ان کے فیصلے کا اعلان ہوا فساد شروع ہو گیا۔

لاہور میں امرتسر اور دوسرے بڑے شہروں کی طرح، اگست کے مہینے میں مذہبی فسادات اپنے عروج پر تھے۔ اس زمانے میں یہ رہنے کے لیے کوئی اچھی جگہ نہیں تھی۔ قتل و غارت اور آتش زنی روز کا معمول تھے اور سچ پوچھیں تو ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ عمر بھر کی دوستیاں اس دور میں شرمندگی بن کر رہ گئی تھیں جب دونوں طرف سے بری خبریں سننے کو مل رہی تھیں۔ ہم ماڈل ٹاؤن میں رہتے تھے جو مذہبی تعلقات کے حوالے سے ایک مثالی علاقہ تھا، شائد اس وجہ سے کہ پوری آبادی تعلیم یافتہ، روشن خیال اور بے حد مہذب لوگوں کی تھی۔

مجھے نہیں یاد کہ ماڈل ٹاؤن میں کوئی بھی قتل ہوا ہو یا کسی بھی مکان کو آگ لگائی گئی ہو۔ ماحول میں موجود کشیدگی کے باوجود ہم ایک دوسرے سے مہذب انداز میں پیش آتے۔ یہاں بہت سی ایسی مثالیں دیکھنے میں آئیں کہ مسلمان خاندانوں نے سکھ اور ہندو خاندانوں کو اپنے ہاں اس وقت تک رہنے کے لیے بلا لیا جب تک امن و امان بحال نہ ہو جائے۔ مگر قدرتی بات ہے کہ لوگ ان تمام واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے جو چند میل دور شہر میں ہو رہے تھے۔

میں نے لاہور سے واپس جونا گڑھ جانے سے پہلے اپنے گھر والوں کے ساتھ اپنی ایک پھوپھی زاد بہن کی مبارک باد کی تقریب میں شرکت کی۔ وہ ایک صوبائی سرکاری افسر کی بیوی تھی اور اسے 20 اگست کو یا اس کے آس پاس مشرقی پنجاب سے یہاں لایا گیا۔ اس کا شوہر کسی میٹنگ کے سلسلے میں لاہور آیا ہوا تھا اور واپس اپنی تقرری کے شہر ہوشیار پور نہ جا سکا اور بانو اور اس کی ننھی بیٹی فسادات میں پھنس گئے اور اس کے پاس نہ پہنچ سکے۔ ایک دوسرے افسر گپور سنگھ نے بانو کو لاہور پہنچانے میں مدد کی

اوراس کے الزام کی قطعاً پرواہ نہ کی کہ وہ پاکستانیوں کو بچ نکلنے میں مدد دے رہا ہے۔ بعد میں جب امن وامان بحال ہو گیا تب بھی کپور سنگھ، محموداور بانو سے اپنی دوستی قائم رکھنے کے لیے لاہور آتا رہا۔

اس زمانے میں لاہور کا سب سے اندوہناک واقعہ دیال سنگھ کالج کے پروفیسر برج نارائن کا قتل تھا۔ شائد وہ پنجاب میں بلکہ شائد پورے انڈیا میں اکیلے غیر مسلم تھے جو یہ کہتے تھے کہ نئی مسلمان ریاست کا مستقبل تابناک ہوگا۔ وہ ایک معیشت دان تھے اوران کی پیشن گوئی حقائق اور اعدادوشمار پر مبنی تھی۔ ان کو یقین تھا کہ پاکستان نہ صرف معاشی اعتبار سے زندہ رہنے کے قابل ہے بلکہ ایک آزاد ملک کی حیثیت سے خوشحال ہو سکے گا۔ یہ سوچا جا سکتا تھا کہ ان کے اپنے ہم مذہب ہی ان کے خون کے پیاسے ہوں گے کیونکہ وہ پاکستان کے تصور کی حمایت کرتے تھے مگر المیہ یہ تھا کہ انہیں مسلمان غنڈوں نے قتل کیا۔ وہ صرف اس لیے مارے گئے کہ وہ ہندو تھے۔

اوراب میں آپ کو اپنے جونا گڑھ سے بچ کر نکلنے کی کہانی سناتا ہوں، جہاں، جیسا کہ میں نے پہلے بتایا، میں ریاست کی ریلوے میں کام کرتا تھا۔ یہ میری بے وقوفی تھی کہ میں ریاست پر انڈیا کے حمایت یافتہ آزادی پسندوں کے قبضہ کر لینے کے بعد بھی وہیں رہتا رہا۔ انسان کی بنیادی بھلائی پر اپنے یقین کی بناء پر میرا خیال تھا کہ کوئی بھی میری پرواہ نہیں کرے گا کیونکہ میں ایک غیر سیاسی شخصیت تھا۔ مگر میں یہ بھول گیا کہ میں ایک پاکستانی تھا۔ آخر میرے دوستوں نے مجھے احساس دلایا کہ مجھے کیا کچھ درپیش ہوسکتا ہے تب میں وہاں سے بھاگا۔

میں پڑوسی ریاست جام نگر کے لیے ٹرین پر سوار ہو گیا اور وہاں سے کراچی کے لیے جہاز میں بیٹھا۔ ریلوے ورکشاپ میں میرا ایک بڑا عزیز دوست ہوا کرتا تھا اس کا نام لکشمی شنکر تھا۔ اصل کہانی تو یہ ہے کہ میں کس طرح اپنے سامان کے بغیر وہاں سے نکلا تا کہ کسی کو میرے بارے میں کوئی شک نہ ہو اور مسز لکشمی شنکر (خدا ان پر رحمت کرے) میرے پیچھے میرا سامان لیکر پہنچیں۔ مجھے جام نگر ائر پورٹ تک باحفاظت پہنچا کر آنسوؤں کے ساتھ خدا حافظ کہنے کے بعد وہ واپس چلی گئیں۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا

کہ ان میاں بیوی پر غداری کا الزام لگا دیا گیا کہ انہوں نے مجھے بچ نکلنے دیا۔ مگر جیسا کہ میں نے گردیال کو لکھا اچھے لوگ دونوں طرف تھے۔

یہ نہیں ہے کہ جونا گڑھ میں میری زندگی خطرے میں تھی مگر دوسرے لوگوں کے ساتھ جو باہر والے سمجھے جاتے تھے برا سلوک کیا جا رہا تھا۔ ان میں جونا گڑھ آرمی کا ایک لیفٹننٹ واحد بھی تھا جسے شدید تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اسے چھ ماہ کے بعد جیل سے رہائی ملی، وہ کراچی آ گیا اور پاکستان آرمی میں شمولیت اختیار کر لی۔ اتفاق دیکھیے کہ جب نواب آف جونا گڑھ نواب دلاور خان جی سندھ کے گورنر بنے تو اسے ملٹری سیکرٹری بنایا گیا۔

کتاب کی طرف لوٹتے ہیں، یہ ایک دکھ بھری، خوفناک اور دردناک کتاب ہے۔ اس میں تقسیم اور بڑے پیمانے پر ہجرت کی بے شمار کہانیاں ہیں۔ ساتھ ساتھ مصنفوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ انہوں نے قتل و غارت گری اور آتش زنی کو کیسے دیکھا اور لوگوں کو بچانے کی بے مثال کہانیاں بھی ہیں۔ یہ داستانیں ہندوستانی اور پاکستانی دونوں نے لکھی ہیں۔ جیسا کہ آپ نے دیکھا ان میں سے کسی نے واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی اور وہی کچھ بیان کیا جو انہوں نے دیکھا اور انہوں نے کسی کو بھی قصوروار یا بے قصور ٹھہرانے کا کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا۔ جیسا کہ میں انیس جیلانی کی بات کو سمجھ سکا ہوں اس کتاب کی اشاعت کا مقصد گزرے ہوئے خوفناک واقعات کی یاد تازہ کرنا اور مذہبی منافرت کو دوبارہ زندہ کرنا نہیں بلکہ ان کہانیوں کو پرانے زخموں کے لیے مرہم کی طرح استعمال کرنا ہے۔ خدا سرحد کے دونوں طرف بسنے والے انسانوں کو اچھی سوجھ بوجھ دے۔

——— حفیظ الرحمٰن

عذاب تھا جو میں نے دیکھا

50 برس گزر جانے کے بعد بھی ستیش گجرال، ممتاز مصور، مجسمہ ساز، ماہر تعمیرات اور سابق وزیراعظم اندر کمار گجرال کے بھائی، بچوں اور عورتوں کی چیخیں نہیں بھول پائے۔ ان کے لئے یہ اذیت اب بھی جاری ہے۔

عورتوں اور بچوں کی چیخیں بہت سے ذہنوں پر نقش ہیں۔ کھوئے ہوؤں کے لئے آنسو۔ انسانوں کے وحشی درندوں میں بدلنے کا منظر۔ ملک ایک پر تشدد داخلی بحران کے جھٹکوں میں گرفتار تھا۔ کلکتہ کے فسادات کے ردعمل میں ہندو مسلم فسادات، کلکتہ سے بہار، بہار سے نواکھلی اور پھر شمال مغربی صوبے اور پنجاب تک پھیل گئے۔ جب یہ آگ جہلم پہنچی تو قابو سے بالکل باہر تھی۔

1944 میں جب میرے والد قید کی سزا کاٹ کر رہا ہوئے تو انہوں نے قانون کی پریکٹس دوبارہ شروع نہیں کی۔ یہ ان کے مہاتما گاندھی پر بڑھتے ہوئے اعتماد کا ایک اور اظہار تھا کیونکہ گاندھی قانون کے پیشے کو ذریعہ معاش بنانے کے
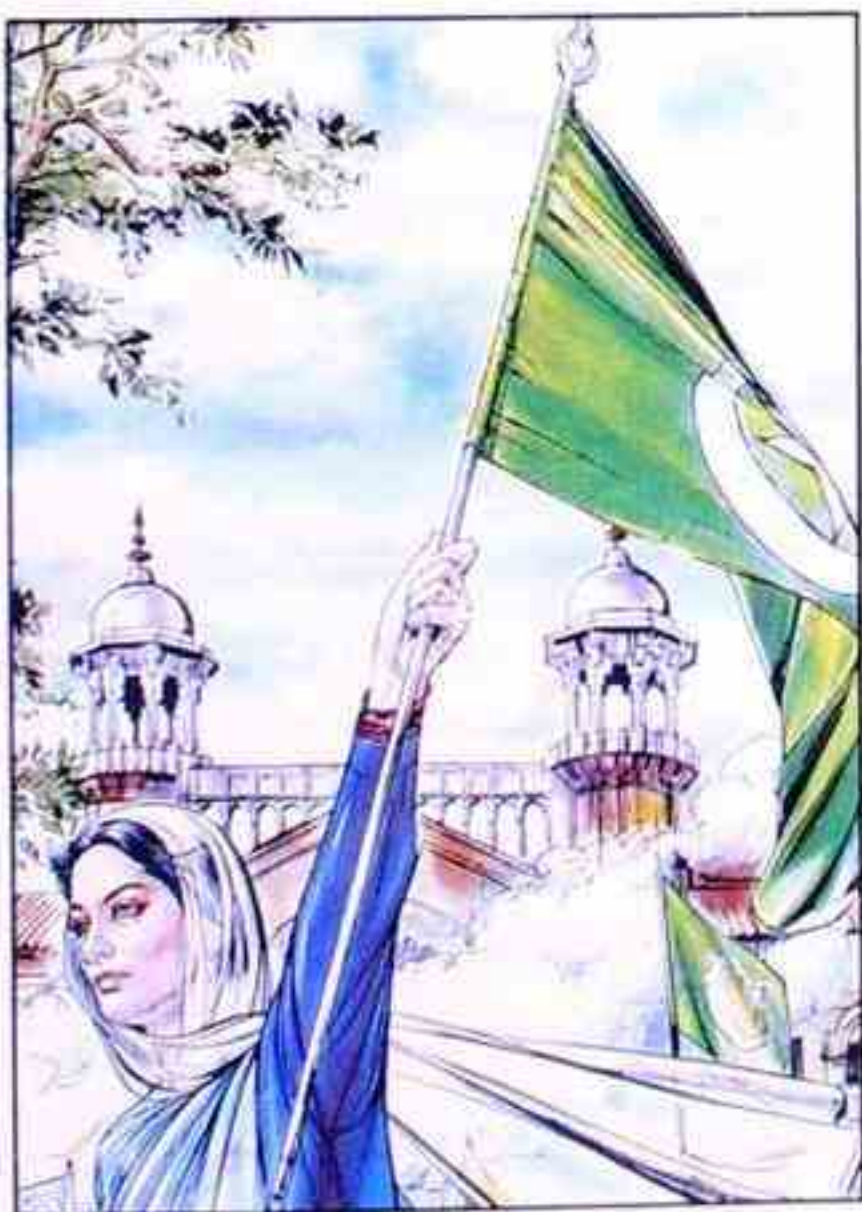
خلاف تھے۔ وکالت سے حاصل ہونے والی آمدنی سے محرومی کے ساتھ اب وہ اپنی اراضی سے ملنے والی آمدنی سے بھی محروم ہو چکے تھے۔ ان کے اکثر مزارعے مسلمان تھے جو اپنے ہندو مالکان کو ان کا جائز حصہ دینے کے لئے بھی تیار نہ تھے۔ اب ان کے پاس مجھے بمبئی میں رکھنے کے لئے پیسے بھی نہ تھے۔

1946 میں بمبئی سے واپس آ کر میں نے لاہور میں ایک گرافک آرٹ سٹوڈیو قائم کیا۔ بجائے اپنے والد کے معاشی بوجھ کو گھٹانے کے میں نے ان کی بچی کھچی پونجی بھی اپنے اللوں تللوں میں اڑا دی۔ یہ میری بہت بڑی حماقت تھی کیونکہ ان دنوں شمالی ہندوستان میں زندگی دن بدن ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ کسی کو کچھ پتا نہ تھا کہ آنے والے دنوں میں کیا ہوگا۔ گاہک تو مجھے کیا ملتے بس میں سارا دن تانگوں کی ختم نہ ہونے والی قطاروں کو دیکھتا رہتا جن پر ہندو اور سکھ خاندان اپنے ٹرنک اور بوریے بستر لئے ریلوے سٹیشن کے طرف رواں دواں رہتے۔ وہ اپنا مال و متاع سرحد کے اس پار ان علاقوں میں منتقل کر دینا چاہتے تھے جو ان کے خیال میں انڈیا کے حصے میں آنے تھے اور اس طرح ان کے لئے محفوظ تھے۔

اسی زمانے میں میرے والد راولپنڈی سے نو تشکیل شدہ آئین ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ جہلم اس ڈویژن کا حصہ تھا۔ ملک کے انڈیا اور پاکستان میں بٹتے ہی ان کی رکنیت کراچی منتقل کر دی گئی۔ ابھی وہ کراچی میں پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھانے کے منتظر تھے کہ پنجاب کے دونوں طرف بڑے پیمانے پر خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اب کسی کو یہ شبہ نہ رہا کہ ہندو اور سکھ پاکستان میں قبول نہیں کئے جائیں گے۔

میں لاہور ہی میں شہر کے مختلف حصوں کو شعلوں کی لپیٹ میں آتے دیکھتا رہا۔ فسادات اور آگ میرے گھر کے، جو نشاط سنیما کے پاس ہی تھا، زیادہ سے زیادہ قریب آتے گئے۔ ایک دفعہ جب غنڈے میری تھوڑی بہت متاع لوٹنے ہمارے گھر میں گھس آئے تو ہمیں بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگنے کا موقعہ مل

سکا۔ جس واحد محفوظ پناہ گاہ کا خیال میرے ذہن میں آیا وہ لاجپت رائے بھون تھا جس میں میرے والد کے دوست لالہ اچنت رام اور مجلس خدام عوام (Servent of People Society) سے تعلق رکھنے والے دوسرے لوگ رہ رہے تھے۔ میں نے پانچ کلومیٹر کا راستہ ایک دوڑ میں ہی طے کرلیا اور بھی بہت سے لوگ ان مسلمان بلوائیوں سے بچ کر بھاگ رہے تھے جو ہندوؤں اور سکھوں کی جان اور مال پر اپنا غصہ نکال رہے تھے۔

جب میں بھون کے اندر پہنچا تو مجھے اس افتاد کی صحیح صورت حال کا اندازہ ہوا جس نے شہر کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ بھون اور اس سے ملحقہ ڈی اے وی کالج کا ہاسٹل آفت زدہ خاندانوں سے ابل رہا تھا اور ہر لمحے نئے خاندان چلے آرہے تھے۔ ان عمارتوں کو پناہ گزینوں کا مرکزی کیمپ بنا دیا گیا تھا اور ڈوگرہ رجمنٹ کا ایک دستہ اس کی حفاظت پر مامور کردیا گیا تھا۔ ہمیں ابھی 14 اگست کے دن کا مزید دو ہفتے انتظار کرنا تھا جب پاکستان کو ایک آزاد خودمختار اسلامی ریاست بننا تھا۔ لیکن ابھی ہمیں لاہور کی قسمت کا کچھ علم نہیں تھا کہ یہ شہر ہندوستان میں شامل ہوگا کہ پاکستان میں۔ ہم سخت اعصابی تناؤ کے عالم میں ریڈکلف ایوارڈ کا انتظار کررہے تھے جس نے اس مسئلے کو طے کرنا تھا۔ فضا میں افواہیں ہی افواہیں تھیں۔ زیادہ تر اخبارات اشاعت بند کرچکے تھے۔ اس سے ابہام اور بھی بڑھ گیا تھا۔ جو لوگ ابھی گھروں میں رکے ہوئے تھے مستند خبروں کی تلاش میں کیمپ کے طرف آتے۔ لیکن کوئی خبر مستند نہ تھی۔

آخرکار 13 اگست 1947 کو ریڈکلف ایوارڈ کا اعلان ہوگیا۔ اس کے مطابق لاہور کو پاکستان کے حوالے کیا گیا تھا۔ اگلے دن مملکت پاکستان سرکاری طور پر ایک آزاد حیثیت سے وجود میں آگئی۔

میرے والد کے زندگی بھر کے مشن کا جو نتیجہ سامنے آیا اسے ستم ظریفی سے کم اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے وطن کے آزادی کے لئے جدوجہد کی اور تکلیفیں برداشت کیں۔ اب آزادی تو مل چکی تھی مگر

وطن اب ایک کی بجائے دو تھے۔ ان کا وطن کون سا ہے؟ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح انہیں بھی یقین تھا کہ جب تشدد اور بدامنی کی لہر تھمے گی تو دونوں مذہبی گروہ نئی طے شدہ سرحدوں کے دونوں طرف امن وامان کے ساتھ رہنے شروع ہو جائیں گے۔

نئی ریاست کے کئی رہنما ان کے دوست تھے اور وہ اس کے بانی محمد علی جناح کے بھی قریب تھے۔ انہیں اشارہ دیا گیا تھا کہ محمد علی جناح انہیں اپنی کابینہ میں شامل ہونے کی دعوت دینے والے ہیں۔ وہ اس توقع کے ساتھ کراچی پہنچے کہ پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھائیں گے اور شائد وہ گورننگ کونسل کے پہلے اور واحد غیر مسلم رکن ہوں گے۔ لیکن جب تک انہوں نے پاکستانی پارلیمنٹ کی رکنیت کا حلف اٹھایا، دونوں قومیں جنگ کے دہانے پر پہنچ چکی تھیں۔ پاکستانی اور بھارتی، پنجاب کے دونوں حصوں میں فرقہ وارانہ فسادات پھیل چکے تھے۔

میرے والد کو اس امید پر ایک فوجی طیارے کے ذریعے لاہور بھیجا گیا کہ شائد وہ اس قتل و غارت کو رکوانے میں کامیاب ہو جائیں جسے بے رحمانہ آتش زدگی اور لوٹ مار نے مزید بگاڑ دیا تھا۔ شام کو جب وہ پنڈت نہرو اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن سے ملے جو نئی دہلی سے پرواز کر کے لاہور پہنچے تھے تو ان کا اعتماد بری طرح مجروح ہو چکا تھا۔ یہی حال نہرو کا تھا۔ ان دونوں میں سے کسی کو بھی ایسی کوئی خوش فہمی نہیں رہی تھی کہ یہ دونوں ملک کبھی بھی دوست پڑوسی ملکوں کے طرح رہ سکیں گے۔ نہرو نے میرے والد سے پوچھا کہ کیا یہ ہندو مسلم فسادات کبھی ختم ہو سکیں گے؟ بہرحال، میرے والد کو بہت حیرانی ہوئی جب نہرو نے ان سے یہ سوال کیا۔ اس وقت میز کے گرد کئی لوگ بیٹھے تھے۔ یہ بات آج تک ایک راز ہے کہ انہوں نے اس سوال کے لئے میرے والد ہی کو کیوں چنا جن کے ساتھ ان کی جان پہچان بس سرسری سی تھی۔ یا شائد، جیسا کہ میرے والد نے بعد میں ہمیں سمجھانے کی کوشش کی، پنڈت جی نے صرف اپنا رخ ان کی جانب کیا تھا مگر یہ سوال دراصل انہوں نے خود اپنے آپ سے ہی کیا تھا۔ میز کے گرد بیٹھے سبھی لوگوں کی پریشان نظری کا یہی عالم تھا، جن میں جناح کابینہ کے نئے وزیر راجا غضنفر علی بھی

شامل تھے۔ غضنفر علی کا تعلق جہلم سے تھا۔ وہ اپنی دوستی کے اظہار کے لئے کراچی سے میرے والد کے ساتھ آئے تھے۔ یہ میٹنگ مایوسی اور بددلی کے احساس کے ساتھ ختم ہوئی۔

اگلے روز راجہ غضنفر علی ہمارے ساتھ گاڑی میں جہلم آئے، جو لاہور سے تقریباً ایک سو میل کے فاصلے پر ہے۔ سیاسی اختلافات نے ان دونوں حضرات کی دوستی میں کوئی فرق نہیں ڈالا تھا۔ یہ خاصی عجیب بات تھی کیونکہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف مزاج رکھتے تھے۔ میرے والد گوشہ نشین اور کسی حد تک اخلاقیات پرست تھے، راجہ غضنفر ایک خوش طبع، ملنسار، بے جھجک اور نسوانی صحبت کے دلدادہ تھے۔ وہ سر سکندر کی یونینسٹ پارٹی کے رکن تھے۔ جب سر سکندر فوت ہوئے تو غضنفر علی نے جناح کی مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور پنجاب اسمبلی کی نئی کابینہ میں اس کے واحد نمائندے ہوئے۔ نئی کابینہ میں شرکت کے بعد انہوں نے جناح صاحب کو وزارت کے لئے میرے والد کا نام تجویز کیا تھا۔

لاہور سے جہلم تک کا سفر گزرے ہوئے واقعات کی خوفناک یاددہانیوں سے بھرپور تھا۔ ہر سنگِ میل پر ان دونوں حضرات کے چہرے مزید دکھی اور پرتشویش ہو جاتے۔ ابھی دریائے جہلم کا پل بھی نہ آیا تھا کہ غضنفر علی نے میرے والد سے پوچھا کہ آیا وہ اب بھی ضلع جہلم چھوڑ کر چلے جانے والے

غیر مسلموں کے مخالف ہیں اور پھر میرے والد کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ ان کے کندھے پر جھکے اور کہا" لالہ جی، ہمیں ان کو روکنے کے لئے اپنی بھر پور کوششیں کرنا ہوں گی۔" اگرچہ میرے والد نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا مگر انہوں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ ان کی خاموشی کا مطلب رضامندی ہے۔

ایسا لگتا تھا کہ دونوں نے اپنے حامیوں پر اپنے اثرورسوخ کا مبالغہ آمیز اندازہ لگا رکھا تھا۔ جہلم پہنچنے پر انہوں نے جو مشترکہ بیان جاری کیا اس کے دونوں ملکوں کے ذرائع ابلاغ نے خوب تشہیر کی۔ گاندھی جی اور جناح نے بھی اس کی تعریف کی۔ لیکن حالات کو معمول پر لانے کی ان کی تمام کوششیں حقیقی صورت حال میں ایک مذاق بن کر رہ گئیں۔ جہاں کہیں بھی انہوں نے خطاب کیا انہیں ایک معاندانہ ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ ہندو اور سکھ میرے والد کی اس اپیل پر پیچ پا ہو گئے کہ وہ اپنے گھر چھوڑ کر مت جائیں اور ان پر الزام لگایا کہ وہ انہیں قربانی کا بکرا بنا رہے ہیں۔ اگرچہ مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات کبھی بھی دوستانہ اور پرسکون نہ رہے تھے مگر تشدد کا کوئی واقعہ شاذونادر ہی رونما ہوتا تھا۔ چھوٹے قصبوں میں یہ تقسیم صرف ٹھوس اور مستقل تھی۔ ہندو، مسلم بیگانگی سماجی بھی تھی اور ثقافتی بھی۔ سول لائنز کے علاقے کے سوا، جو صرف ضلعی ہیڈ کوارٹر میں ہوتا ہے، باقی تمام جگہوں پر دونوں مذہبی گروہ الگ الگ حد بندی والے علاقوں میں رہتے تھے اور ان کے پیشے بھی مختلف تھے۔ مسلمان زراعت پیشہ تھے، جبکہ سکھ اور ہندو جو مغربی پنجاب کے شہروں میں رہتے تھے زیادہ تر نوکری پیشہ، دوکان دار، مہاجن (سود پر لین دین کرنے والے) اور تاجر تھے۔ حد تو یہ کہ میو سکول کے ہاسٹل میں بھی، جہاں رہائشیوں کی کل تعداد کبھی بیس سے زیادہ نہ ہوتی تھی، ہندو اور مسلم سیکشن بالکل الگ الگ تھے۔ گو باہمی ملنساری کا بھرم رکھا جاتا تھا مگر اس نسلی اور مذہبی خلیج کو پاٹنے کی کوئی کوشش نہ کی جاتی جس نے طلباء کو تقسیم کر رکھا تھا۔ اگرچہ ہم کھیل کے میدانوں میں اکٹھے ہوتے۔ کمرہ جماعت میں ساتھ ساتھ بیٹھتے اور کبھی کبھار ایک دوسرے کے کمروں میں بھی جاتے مگر ہم ہاسٹل کے الگ الگ حصوں میں رہتے اور ہمارے باورچی خانے کے کمرے بھی الگ الگ تھے۔

جہلم اس خطے کے دوسرے شہروں سے مختلف نہ تھا۔ اس کی 15 ہزار کے لگ بھگ کی کل آبادی میں نصف ہندو اور نصف مسلمان تھے۔ سکھوں کو ہندو آبادی کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ علیحدگی کے باوجود روزمرہ زندگی میں دوستانہ لین دین کافی تھا۔ کیونکہ دونوں مذہبی گروہ اپنی بقا کے لئے ایک دوسرے پر انحصار کرنے پر مجبور تھے۔ لیکن ایسا شاذ ونادر ہی ہوا ہوگا کہ یہ میل جول ایک دوسرے کے گھر کھانے پر جانے تک بڑھا ہو۔ سماجی میل جول میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندوؤں کے مسلمانوں کے ساتھ کھانا کھانے کے بارے میں تعصبات تھے۔ قدامت پرست ہندوؤں کی نظر میں مسلمانوں کی کھانے کی چند عادات انہیں پست ترین ہندو ذات کے لوگوں جیسا ناقابل قبول بناتی تھیں۔

میرے والد نے شہری لوگوں کو ان تعصبات سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن انہیں بہت کم حمایت ملی۔ انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی ایک شاخ جہلم میں قائم کی لیکن مسلمانوں کی طرف سے انہیں کوئی عملی مدد نہ ملی۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوؤں نے کانگرس کے بارے میں پرجوش ردعمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ مسلمانوں کے علیحدہ رہنے کی مزید ایک وجہ بنی۔ میرے والد کے لئے یہ دریافت اور بھی تکلیف دہ ثابت ہوئی کہ جن ہندوؤں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کی وہ آزادی کے بارے میں تو بہت پرجوش تھے لیکن مسلمانوں کو دوست بنانے یا اچھوتوں کے بارے میں اپنا رویہ بدلنے کی کوئی خواہش نہ رکھتے تھے۔

میرے والد نے راجہ غضنفر علی کی یہ تجویز مان لی کہ وہ جہلم کے سکھوں اور ہندوؤں سے یہیں قیام رکھنے کی اپیل کریں۔ لیکن جب تشدد بہت بڑھ گیا تو وہ بھی اس نتیجے پر پہنچے کہ غیر مسلموں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ انڈیا چلے جائیں۔

ہم ابھی جہلم میں ہی تھے کہ اچانک افغان قبائلیوں کے غول کے غول شہر میں وارد ہو گئے۔ وہ ڈوگروں، برہمنوں اور سکھوں کو کشمیر سے نکال پھینکنے اور اس ریاست کا الحاق پاکستان سے کرانے جا رہے تھے۔

چونکہ جہلم، کشمیر کے سرحدی شہر میرپور سے قریب ترین چھاؤنی تھی اس لئے پاکستانی فوج کے کمانڈروں نے اسے کشمیر پر یلغار کے لئے اکٹھے ہونے کے مقامات میں شامل کیا۔ پاکستانی رہنما خود کوئی خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور انہیں امید تھی کہ سرحد کے قبائلی ان کے لئے یہ کام کر دکھائیں گے۔

یہ قبائلی، جو پاکستان اور افغانستان کے درمیان آزاد علاقے کے رہنے والے تھے، نہ کسی قانون کے پابند تھے نہ کسی حکومت کو مانتے تھے۔ ان کی موجودگی ہی شمال مغربی پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں کے دلوں میں دہشت پیدا کرنے کے لئے کافی تھی۔ کئی صدیوں سے ان قبائلیوں کا پیشہ لوٹ مار اور اغوا برائے تاوان تھا۔ ان کے بنیادی ہدف ہندو اور سکھ تھے کیونکہ قبائلی نکتہ نظر یہ تھا کہ کافروں کو قتل کرنے اور لوٹنے والا مجاہد کے بلند مرتبہ پر فائز ہو جاتا ہے۔ برطانوی حکمران بھی اپنے تمام تر فوجی وسائل کے باوجود، ان بے مہار قبائلیوں کو تابع کرنے میں ناکام رہے تھے اور انہیں ان کی جرگوں کے کنٹرول میں ہی چھوڑ گئے تھے۔

وہ دن ناقابل فراموش ہے جب جہلم میں پہلا قبائلی دستہ اترا۔ انہوں نے ہمارے مہاجر کیمپ پر ایسے نظر جمائی جیسے کوئی درندہ اپنے شکار کو جانچتا ہے۔ پھر انہوں نے ڈھول کی تھاپ پر اپنا روایتی خٹک ناچ شروع کرتے ہوئے کیمپ کے گرد گھیرے میں گھومنا اور یوں ہوا میں فائرنگ کرنا شروع کر دیا جیسے وہ ہمیں آنے والے خطرے سے خبردار کر رہے ہوں۔ اگرچہ راجہ غضنفر علی کی قیادت میں مقامی انتظامیہ کے افسران ان کی منت سماجت نہ کرتے تو یہ کہانی سنانے کے لئے نہ تو میں زندہ ہوتا نہ کیمپ کا کوئی دوسرا فرد۔ اس تجربے کے بعد راجہ غضنفر علی بھی اس بات کے قائل ہو گئے کہ پاک سرزمین سے اب غیر مسلموں کے کوچ کر جانے کا وقت آ گیا ہے۔

جوں جوں فسادات کی آگ بڑھتی گئی ہزاروں سکھوں اور ہندوؤں نے ہمارے محلے میں پناہ لے لی جو جلد ہی مہاجر کیمپ بن گیا۔ ہر نو وارد اپنی ایک دردناک داستان لئے آیا، ہر نئی داستان پہلی سے زیادہ

خونچکاں اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی تھی ۔ وقت میرے لئے معنی کھو چکا تھا۔ موت ہماری روزمرہ زندگی میں ایک سنگین حقیقت بن کر اتر آئی تھی ۔

میرے خاموش طبع والد شاذ ہی اپنے جذبات کا اظہار کرتے تھے مگر ایسے بھی لمحے آنے لگے جب تناؤ ان کے پور پور سے ظاہر ہوتا۔ ایسے وقت میں وہ آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتے ۔ وہ خدا ترس آدمی تھے لیکن یہ دیکھ کر کہ خدا کی مخلوق ایک دوسرے سے کس قدر بے رحمانہ سلوک کر سکتی ہے ان کا عقیدہ متزلزل ہو گیا۔ میں حیران تھا کہ وہ پوجا کس کی کرتے ہوں گے۔

جنگجو قبائلیوں کے سبب مقامی ہندوؤں اور سکھوں کا انڈیا کی طرف ترکِ وطن کر جانے کا عزم اور بھی مضبوط ہو گیا اور ہم نے انخلاء شروع کر دیا جو قتل و خون سے اتنا ہی بھر پور تھا جتنا کہ وہ قتلِ عام تھا جو بعد میں برپا ہوا۔ میں تقریباً ہفتے میں دو مرتبہ درجنوں ٹرکوں کے قافلے میں سوار کئی لوگوں کو لے کر ایک ایسے سفر پر روانہ ہوتا جو بہت سوں کے لئے ان کا آخری سفر ثابت ہوتا۔ اگرچہ ہر سفر پر ڈوگرہ دستہ ہمارے ساتھ ہوتا تھا مگر مسلم حملہ آوروں کی گھاتیں برداشت کرنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ کیونکہ ہمارے محافظوں کی تعداد بہت کم ہوا کرتی تھی ۔

حملوں کی نوعیت اور شدت ہر بار مختلف ہوتی ۔ اگر ہم خوش قسمت ہوتے تو ہمیں بندوق کی نوک پر صرف یہ حکم دیا جاتا کہ اپنا مال و متاع حملہ آوروں کے حوالے کر دیں۔ جو لوگ مذاحمت کرتے یا کسی قسم کی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتے ،خاص طور پر عورتیں جو اپنے زیورات دینا نہیں چاہتی تھیں، تو انہیں پکڑ لیا جاتا اور ایسی خوفناک درندگی کے ساتھ ان کی قیمتی اشیاء چھینی جاتیں کہ وہ بری طرح زخمی اور انتہائی خوف زدہ ہو جاتیں۔

پھر بھی یہ منظم قتلِ عام کے روز افزوں واقعات کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا۔ قتل عام میں نہ صرف بچوں، عورتوں اور مردوں سب کو جان سے مار دیا جاتا بلکہ یہ عمل ایسے بے رحم اور خونیں انداز میں کیا جاتا کہ ان لوگوں کے احساسات تک مفلوج ہو جاتے جو ان واقعات کو بے بسی سے دیکھنے پر مجبور تھے اور زندہ بچ گئے تھے۔—

ایک بار لالہ موسیٰ میں، جو امرتسر کے راستے میں جہلم سے 15 میل دور ایک چھوٹا سا شہر ہے، گھات لگانے کے بعد تمام مردوں کو قتل کر دیا گیا، عورتوں کی وہیں پر بے حرمتی کی گئی۔ چند ایک کو اغوا کر لیا گیا اور باقیوں کو قتل کر دیا گیا۔ قتل عام کا جشن منانے کیلئے قاتلوں نے دودھ پیتے بچوں کو نیزوں میں پرو کر ڈھول کی وحشیانہ تھاپ پر بھنگڑا ڈالنا شروع کر دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ یہ واقعہ ایک ایسے مقام پر پیش آیا جو پاکستان کا حصہ تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایسے مظالم خط تقسیم کے اس پار ہی کیے گئے یا یہ کہ ہندوؤں اور سکھوں کو ہی ایسے ہولناک مظالم کا نشانہ بنایا گیا، میں آزاد ہندوستان میں بھی ایسے واقعات کا عینی گواہ ہوں جو کم انسانیت کش نہ تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کا نشانہ مسلمان بنے۔

میں نے مہاجر قافلوں کے ساتھ جو سفر کیے ان میں سے اکثر واہگہ پر ہی تمام نہ ہوتے تھے، جو پاکستان اور ہندوستان کی سرحد پر ایک چھوٹی سی بستی تھی اور جسے سرحدی چوکی بنا دیا گیا تھا۔ اور نہ ہی امرتسر پر جو مہاجروں کو جمع کرانے کی آخری منزل تھی، بلکہ اکثر مجھے جالندھر تک جانا پڑتا تھا۔ بعض اوقات بھولی ہوئی لڑکیوں اور بچوں کو پہنچانے کے لئے، جنہیں ہم اغوا کرنے والوں کے چنگل سے چھڑا کر لاتے تھے اور کبھی نئی حکومتِ مشرقی پنجاب سے ضروری امداد حاصل کرنے کے لئے جو جالندھر میں عارضی طور پر قائم کی گئی تھی۔ کیونکہ میرے والد ایک سرکاری حیثیت کے مالک تھے اس لئے انہوں نے مجھے ایک مختار نامہ دے رکھا تھا جسے دکھا کر میں آسانی سے سرحد پار کر لیتا تھا۔ ہم اپنے ساتھ ایک مسلح دستہ لے جاتے تھے تا کہ عورتوں کو بازیاب کرا سکیں، عورتوں کی بازیابی کے فوراً بعد میں خود انڈیا کے علاقے

میں قائم کیمپ میں پہنچا کر آتا تھا۔ میرے والد نے اس بات کا انتظام کر رکھا تھا کہ کسی قسم کی مزاحمت کی صورت میں میری زندگی محفوظ رہے اگرچہ ان کی اپنی زندگی محفوظ نہ تھی۔

اس طرح نہ چاہتے ہوئے بھی میں۔ ہندوستانی علاقوں میں قتل عام کا چشم دید گواہ بن گیا۔ ان میں بدترین واقعہ امرتسر میں لڑکیوں کے ہاسٹل پر حملہ تھا۔ ان لڑکیوں کو ننگا کر کے جلوس کی صورت میں شہر کے مرکزی بازار، ہال بازار، سے گزارا گیا۔ ان کی اجتماعی عصمت دری کی گئی اور قتل کئے جانے سے پہلے ایسا ناقابل بیان انسانیت سوز سلوک کیا گیا جس کا تصور کوئی انتہائی ظالم اور اذیت پسند ذہن ہی کر سکتا تھا۔ ہماری گاڑی کو رکنا پڑا کیونکہ سڑک پر یہ ہولناک تماشہ دیکھنے کے لئے شائقین کا ہجوم تھا۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے میں نے ہجوم کے چہروں پر دہشت یا ہمدردی کے تاثرات تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مجھے ایسا کوئی نشان نہیں ملا۔

تقسیم کی اذیتیں اپنا اثر ان تمام لوگوں پر چھوڑ گئیں جو ان واقعات کو دیکھ رہے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسے ہولناک مناظر میرے اندر اتنا شدید کراہیت انگیز احساس پیدا نہ کرتے جتنا کہ میں شروع شروع میں محسوس کیا کرتا تھا۔ میرے اندر احساسات رفتہ رفتہ سن ہو گئے۔ کوئی افتاد میرے ان منجمد احساسات پر اثر انداز نہیں ہوتی تھی جو پتھر کی طرح بے حس ہو چکے تھے۔

تقسیم کے اس رزمیے میں اگر کوئی منظر حیات پرور تھا تو وہ مخالف سمتوں سے آتے ہوئے مہاجر قافلوں کا باہمی حسن سلوک تھا۔ اگرچہ آمنا سامنا ہونے پر باہمی قتل بھی برپا ہوئے لیکن ایسے واقعات کی تعداد زیادہ ہے جن میں طرفین نے اپنے مشترکہ مقدر پر ایک دوسرے سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو پانی مہیا کیا اور دوسری اہم ضروری اشیاء فراہم کیں۔ مگر سب سے زیادہ اہم بات باہمی مفاہمت تھی جو ان موقعوں پر نظر آئی۔

ایسا ہی ایک آمنا سامنا سانحہ بیاس پر ختم ہوا۔ ایک افتاد جو انسانوں نے نہیں فطرت نے برپا کی، جو اس برس بنی نوع انسان کو اسی طرح مٹا ڈالنے پر تلی ہوئی تھی جس طرح انسان خود اپنے آپ کو ہلاک کیے دے رہا تھا۔ موسلا دھار بارشوں کے بعد سیلاب آچکا تھا۔ ستمبر 1947 میں پنجاب کے پانچوں دریاؤں میں سیلاب تھا اور انہی دنوں مہاجروں کی نقل مکانی اپنے عروج پر تھی۔

بے خانماں اور تارکِ وطن افراد صرف ٹرکوں یا ٹرینوں کے ذریعے ہی فرار نہیں ہو رہے تھے بلکہ ان کی ایک بہت بڑی تعداد پیدل اور بیل گاڑیوں پر سوار ان سرحدوں کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہی تھی جو برصغیر کی سرزمین پر تازہ تازہ نقش کی گئی تھیں۔ یہ قافلے درجنوں میل لمبے تھے۔ اتنے لمبے کہ ہراول دستے سرحد پار بھی کر لیتے مگر پچھلے حصے ابھی عافیت کی منزل سے کئی دنوں کی مسافت پر ہوتے۔ اکثر یہ قافلے گھات سے نکل کر آنے والے حملہ آوروں کے سامنے تتر بتر ہو جاتے اور شائد ہے کوئی قافلہ پورے کا پورا سرحد پار کرنے میں کامیاب ہوا ہوگا۔

سانحۂ بیاس میں ایک نہیں بلکہ آمنے سامنے سے آنے والے دو قافلے برباد ہوئے، انہوں نے اس سڑک پر ڈیرے ڈالے ہوئے تھے جو بیاس اور اس کے ایک معاون موسمی دریا کے درمیان واقع تھی۔ موسلا دھار بارشوں نے ان بے آسرا، ستم رسیدہ روحوں کو جلد ہی مصائب سے چھٹکارا دلا دیا۔ بیاس اور اس کے معاون دریا دونوں ہی برسات میں اپنے کناروں سے اوپر چڑھ آئے اور ہزاروں انسانوں اور جانوروں کو بہا کر آبی قبر میں اتار گئے۔

اس سانحے کے ہفتوں بعد بھی گلتی سڑتی لاشوں کے سخت تعفن سے بچنے کیلئے ناک کو تولیوں کی تہوں میں دبائے بغیر یہاں سے گزرنا ناممکن تھا۔ نہ کسی کی تدفین ہوئی، نہ کسی کی چتا جلی۔ اس علاقے سے گزرتے ہوئے مجھے بھی دوسرے لوگوں کے طرح اس بات کی فکر زیادہ تھی کہ غلیظ ہوا میں سانس لینا

بیماری کا باعث بن سکتا ہے بہ نسبت اس دکھ کے کہ اس مقام پر اتنی بہت سی جانیں المناک طور پر ضائع ہوگئیں۔

اس فیصلہ کن دن کو بیتے پچاس برس گزر چکے ہیں اور آج جبکہ میں یہ سطور قلم بند کر رہا ہوں تو حیران ہوں کہ زیادہ بڑا سانحہ کیا تھا، لاکھوں زندگیوں کا ضیاع اور اس سے بھی کئی گنا زیادہ انسانوں کے گھربار کا اجڑ جانا یا میرے اور بہت سے دوسرے لوگوں کے اندر دردمندی کے جذبے کی موت؟ دردمندی ہی وہ خصوصیت ہے جو انسانوں کو جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ تقسیم سے متاثرہ لوگوں میں سے، خواہ ان کا تعلق کسی بھی عقیدے سے ہو، کتنے ہوں گے جن میں اس قدر دہشت اور کرب کا سامنا کرنے کے بعد بھی دردمندی کا جذبہ باقی بچا ہوگا؟

مارچ 1948 تک ہم اس علاقے سے کیمپ میں آنے والے بیشتر خاندانوں کو انڈیا پہنچانے میں کامیاب ہو چکے تھے جو میرے والد کے ذمے تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ کام کبھی ختم نہ ہوگا کیونکہ ابھی بہت سی اغوا شدہ جوان عورتوں کی بازیابی، کھوئے ہوئے بچوں کی تلاش کا کام باقی تھا اور ایسے بہت سے لوگ ابھی وہیں پھنسے ہوئے تھے جنہیں مسلمان دوستوں نے ازراہِ ہمدردی اپنے ہاں پناہ دے رکھی تھی۔ ہندوؤں اور سکھوں کو بچا کر نکالنا اور بھی پرخطر ہوگیا تھا کیونکہ ہمارے علاقے میں بہت سے ریٹائرڈ فوجی رہتے تھے جنہیں اسلحہ اور گولا بارود رکھنے کی اجازت تھی۔ مقامی انتظامیہ اس قسم کی مسلح اور خطرناک آبادی سے نمٹنے کیلئے تیار نہ تھی۔ شدید خطرات کے باوجود میرے والد نے ان مصیبت زدہ ہندوؤں اور سکھوں کو مقدر کے حوالے کر کے خود انڈیا فرار ہونے سے انکار کر دیا۔ ان کھوئے ہوئے لوگوں کے خاندانوں نے بھی جو ہماری دیکھ بھال میں مصروف تھے اس وقت تک یہاں سے جانے سے انکار کر دیا جب تک ان کے رشتہ دار مل نہیں جاتے۔

ہماری مشکلات میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب ہماری حفاظت کے لیے تعینات فوجی عملے کے بجائے محض ہلکے ہتھیاروں سے لیس پولیس کا دستہ تعینات کر دیا گیا۔ کشمیر جنگ کے نتیجے میں ہماری حکومت کے رویے میں سختی آ گئی۔ کشمیر میں فوجی نقل و حرکت کے لئے چونکہ جہلم اہم علاقہ تھا اس لئے حکومت ہمیں وہاں سے ہٹا دینا چاہتی تھی۔ ہم نے ہٹنے سے انکار کر دیا اور مزید تین ماہ تک گم شدہ اور اغوا شدہ افراد کی تلاش جاری رکھی۔ ہم تقریباً تین سو افراد کو بچانے اور انہیں ہندوستان پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں سے ہر فرد کی کہانی ایک المناک ڈرامہ تھی۔

میں جسونت سنگھ کور کا قصہ اپنی یادداشت سے بھلانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ اسے کھیوڑہ سے، جو اپنی نمک کی کانوں کے لئے مشہور ہے، بازیاب کیا گیا تھا۔ وہ گاؤں گھاٹیوں سے کوئی پچاس میل نیچے واقع تھا۔ جسونت کور کو، جو ایک پندرہ سالہ سکھ لڑکی تھی، اس کے ہمسائے غلام اسحاق نے اس وقت بچا لیا جب قریبی گاؤں سے آ کر فسادیوں نے ایک رات اس کے گھر حملہ کر دیا۔ بلوے میں اس کا باپ اور دو بھائی قتل ہو گئے تھے۔ اس کی دو بہنوں کو اغوا کر لیا گیا تھا لیکن اس کی ماں اور ایک چھوٹا بھائی بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور مہاجر کیمپ کی جانب آنے والے قافلے میں شامل ہو گئے۔ جسونت یہ سوچ کر کہ پورا خاندان حملے میں قتل ہو چکا ہے مکان کے پیچھے ایک باڑے میں چھپی رہی۔ دو دن بعد جب اجڑے مکان پر قبضہ کرنے غلام اسحاق آیا تو وہ اسے وہاں نظر آئی۔ غلام اسحاق اس لڑکی کے باپ کا دوست تھا۔ اس نے بھی یہی سوچا کہ جسونت کور اپنے خاندان کی آخری نشانی بچ گئی ہے۔ غلام اسحاق، جس کی بیٹیاں جسونت کی عمر کی تھیں، اس جوان لڑکی سے پدرانہ شفقت سے پیش آیا۔ لیکن جنون اور خوف کی فضا میں یہ کافی نہ تھا۔ چنانچہ، اس نے جسونت سے شادی کے ارادے کا اعلان کر دیا۔ نکاح کی رسم بھی ادا کی گئی لیکن شادی کو انجام تک نہ پہنچایا گیا۔ یہ بات صرف قریبی خاندان والوں کو معلوم تھی۔

جسونت کی ماں، کرتاری، جہلم میں اپنے بیٹے کے ساتھ پہنچائی گئی۔ دونوں سکتے کے عالم میں تھے۔ کوئی تسلی کرتاری پر کارگر نہ ہوتی۔ اس نے تب تک کیمپ چھوڑنے سے انکار کر دیا جب تک اس کے بیٹیوں

کو ڈھونڈ نہ نکالا جائے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اپنے خاوند اور اپنے دو بیٹوں کو قتل ہوتے دیکھا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ اس کی بیٹیاں زندہ ہیں۔

ہمارے پاس نہ فوجی تھے نہ پولیس کہ اغوا شدہ عورتوں کی بازیابی میں مدد کرتے۔ میرے والد نے ترغیب و تلقین کا طریقہ اپنایا۔ وہ نمک کے کانوں کی انتظامیہ کے قانونی مشیر رہے تھے اور کھیوڑہ میں چند خاندانی تنازعات بھی انہوں نے نمٹائے تھے۔ غلام اسحاق ان کے مؤکلوں میں سے ایک تھا۔ جب وہ اس سے ملے تو انہیں معلوم نہ تھا کہ جسونت کور اس کی تحویل میں ہے۔ انہوں نے غلام اسحاق سے کھیوڑہ سے اغوا ہونے والی تین لڑکیوں کے بازیابی میں مدد دینے کے لئے کہا۔ اس نے صاف لاعلمی کا اظہار کیا۔ میرے والد کو اپنے خلوص کا یقین دلانے وہ جہلم آیا۔ جسونت کور کی ماں اس کی قدموں میں گری اور رو رو کر بے حال ہوگئی۔ غلام اسحاق نے اس کے ساتھ ہمدردی جتائی مگر اصل بات نہ کھولی۔ اگرچہ اس پر کرتاری کے دکھ کا گہرا اثر ہوا تھا لیکن وہ اس کی بیٹی سے الگ ہونے کو تیار نہ تھا۔ کیونکہ اسے جسونت کور سے محبت ہوگئی تھی۔ گم شدہ لڑکیوں کے ڈھونڈنے کے لئے بھرپور کوشش کا وعدہ کر کے کھیوڑہ لوٹ گیا۔

میرے والد کو جلد پتا چل گیا کہ جسونت غلام اسحاق کے مکان میں ہی ہے۔ ان کا غلام اسحاق پر اعتماد بری طرح مجروح ہوا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس نے جسونت سے شادی کر لی ہے اور یہ کہ علاقے میں اس کا اتنا اثر و رسوخ ہے کہ انتظامیہ کے ہر قسم کے دباؤ کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ کسی طرح جسونت سنگھ کو یہ اطلاع دی جائے کہ بھائی اور ماں زندہ ہیں اور جہلم کے کیمپ میں رہ رہے ہیں۔ اور پھر اس کے فرار کا منصوبہ بنایا جائے۔ جسونت کور کو اطلاع پہنچانے کا کام مقامی حکام کی طرف سے ہمیں دیے گئے پولیس کے دستے کے ایک کانسٹیبل انور خان نے کیا جو شروع سے ہمارے ساتھ شامل رہا تھا۔ اسی نے میرے والد کو جسونت کور کا اتہ پتہ بتایا تھا۔ اب اس نے کسی طرح

لڑکی کہ یہ اطلاع پہنچادی کہ اس کی ماں اور بھائی زندہ ہیں اور جہلم کے کیمپ میں اس سے ملنے کی امید رکھتے ہیں۔

اس نے کسی کو نہیں بتایا کہ وہ لڑکی تک کیسے پہنچا۔ اس وقت تک لڑکی نے غلام اسحاق کا اعتماد جیت لیا تھا اور اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ اپنی ماں اور بھائی سے ملاقات کے لئے جانے دے اور وعدہ کیا کہ وہ واپس اسی کے پاس آجائے گی۔ جس رات وہ جہلم کے لئے روانہ ہوئے انہوں نے شادی کی تکمیل بھی کر لی۔ جب جسونت اپنی ماں سے ملی تو اسے ایک اور دھچکا لگا۔ اسے اپنی ماں سے جدا ہونا بہت مشکل لگا۔ اس نے اقرار کیا کہ وہ اپنی بیوہ ماں کے ساتھ اپنے پیار اور شوہر اسحاق کے ساتھ اپنی وفاداری کے درمیاں بٹ چکی ہے۔ اسحاق جہلم منتقل ہو گیا۔ وہ روز اس سے ملتا۔ یہ صورتحال بہت پرخطر تھی۔ آخر کار جسونت کور نے میرے والد کی تجویز مان لی۔ ایک سہ پہر وہ اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ امرتسر روانہ ہوگئی۔ میرے والد نے اس گروہ کے ساتھ مجھے خاص طور پر بھیجا کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ غلام اسحاق کا غضب ہم پر نازل ہوگا۔ پھر انہوں نے دغا کا نشانہ بننے والے شوہر غلام اسحاق کو یہ خبر سنائی۔ میرے والد حیران رہ گئے کہ بجائے غیض سے پھٹ پڑنے کے وہ رو پڑا اور اس نے بے حساب آنسو بہائے۔ وہ نہایت جسیم شخص تھا۔ اس کی چمکیلی گلابی رنگت اس کے افغانی النسل ہونے کی چغلی کھاتی تھی۔ اس قدر طاقتور شخص کو یوں غم سے نڈھال ہوتے دیکھنا میرے والد کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ غلام اسحاق کو اپنا آپ سنبھالنے میں تھوڑی دیر لگی۔ پھر اس نے میرے والد کو بتایا کہ اس پر کیا بیتی۔ اس نے میرے والد کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اسے مزید شرمندگی سے بچا لیا ہے۔

جسونت کی کہانی یہاں ختم نہیں ہوئی۔ بہت سی دوسری عورتوں اور بچوں کے ساتھ، جنہیں ہم بچا کر لائے تھا، اسے بھی میری ماں کے سپرد کر دیا گیا جنہوں نے ایک عارضی مہاجر کیمپ قائم کر رکھا تھا، جس میں بازیاب شدہ عورتیں اپنے خاوندوں کے آملنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے ان کے پاکستان چھوڑنے کے امکانات تاریک ہوتے جا رہے تھے۔ ان میں سے کئی

عورتیں حاملہ تھیں اوران کے خاندانوں نے انہیں واپس قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔ غیر شادی شدہ لڑکیوں کا ناجائز بچے پیدا کرنا ایسا داغ تھا جوان کے خاندان والوں کو قبول نہ تھا۔

جسونت کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کے غلام اسحاق کے ساتھ رہنے کا نتیجہ ظاہر ہونے لگا۔ پہلے پہل اس کی ماں کرتاری نے اس ہونی کو تسلیم کرلیا۔ لیکن اس کا نوجوان بھائی اس پر تیار نہ تھا۔ خاندان کی عزت خاک میں مل گئی تھی۔ انہیں ساری عمر دوسروں کے طعنے سہنے تھے۔ کرتاری رفتہ رفتہ اپنے بیٹے سے متفق ہوگئی اور دونوں نے جسونت کو مقدر کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ میری ماں کی انہیں کیمپ سے نکال دینے کی دھمکیاں بے اثر رہیں۔ ایک دن وہ جسونت کو اکیلا چھوڑ کر کیمپ سے کھسک گئے۔
جسونت کور جیسی عورتوں کا حشر ہی تھا جس نے میرے والد کی زندگی کا آئندہ راستہ متعین کیا۔ اس وقت تک میرے والد کی پاکستانی پارلیمنٹ کی رکنیت ہندوستانی پارلیمنٹ میں منتقل ہوچکی تھی۔ میری ماں اپنی حفاظت میں رہنے والی عورتوں کو چھوڑ جانے اور انہیں سرکاری مہاجر کیمپوں کے حوالے کرنے کو بالکل تیار نہ تھیں، جو تیزی سے قحبہ خانے بنتے جارہے تھے۔ میرے والد کے پاس اس صورتِ حال میں کوئی اختیار نہ تھا۔ وہ اپنی بیوی سے علیحدہ ہوکر دہلی میں زندگی کا باقی حصہ بسر کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے، انہوں نے جالندھر میں ہی گھر بسانے کا فیصلہ کرلیا۔

انہوں نے ہندوستان کے پارلیمنٹ سے استعفٰی دے دیا اور جالندھر میں ناری نکتین (عورتوں کا گھر) قائم کرلیا۔ اسے بتدریج ایسی عورتوں کے لئے بھی کھول دیا گیا جو تقسیم کی آفت کا نشانہ نہیں بنی تھیں۔ اس ادارے کو میرے والدین 1979 تک چلاتے رہے، جب میرے والد کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد میری والدہ 1988 تک تن تنہا اس ادارے کا انتظام سنبھالتی رہیں۔ 1988 میں میری والدہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد بھی نکتین بند نہیں ہوا۔ میرے والد نے اپنی تمام جمع پونجی نکتین ٹرسٹ کے نام چھوڑی تھی۔ یہ ٹرسٹ میرے بھائی اندر کی نگرانی میں اپنا نیک کام جاری رکھے ہوئے

ہے۔ خوراک اور رہائش مہیا کرنے کے علاوہ یہ ٹرسٹ عورتوں کے بچوں اور یتیموں کے لئے ایک ہائی سکول بھی چلاتا ہے۔

جالندھر کے شہریوں نے ناری نکتین کے سامنے سے گزرنے والی سڑک کا نام میرے والد کے نام پر رکھ کر اپنی شکر گزاری کا اظہار کیا ہے۔ میری والدہ نے بیوہ ہونے کے بعد آٹھ برس گزارے لیکن شہریوں یا حکومت کی طرف سے ہر قسم کے اعزازات لینے سے انکار کر دیا۔ وہ خوش تھیں کہ ان کے شوہر کی عزت افزائی ہوئی ہے اور انہوں نے اپنے شوہر کے بعد از وفات تکریم سے ہی خوشی حاصل کرنے پر قناعت کی۔

—— ستیش گجرال

میں سمجھا قوم ختم ہو جائے گی

مشہور مصنف اور کالم نگار خشونت سنگھ کا خیال ہے کہ آزادی سے خوشیاں آنی چاہئیں تھیں مگر اس کی بجائے اس سے دکھ، دل شکستگی اور سب سے بڑھ کر خون خرابہ پھیلا۔

حیرانی کی بات ہے کہ مجھے شدید مسلم دشمن تعصبات کے ساتھ پالا گیا تھا مگر یہ تمام تعصبات میرے مسلمان دوستوں سے میل جول اور تقسیم کے دوران پھیلنے والی درندگی نے دور کر دیے۔ جو کچھ مسلمان، ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ کر رہے تھے اور جو سلوک ہندو اور سکھ، مسلمانوں کے ساتھ کر رہے تھے اس میں کوئی فرق نہیں تھا۔ مجھے ان سب پر شرمندگی ہے۔

یہ واقعات میری زندگی میں اس لحاظ سے ایک اہم موڑ ثابت ہوئے کہ میں مذہب کے خلاف ہو گیا۔ ان سب میں ہی عقل کا فقدان تھا۔ جہاں تک باتوں کا تعلق تھا وہ بڑے بڑے لفظ بولتے، انسانیت سے محبت اور پڑوسی سے نیک دلی کا پرچار کرتے۔ مگر جب عمل کا وقت آیا تو وہ درندے بن گئے۔ سب کے سب۔ میرا نہ صرف انسانیت سے ایمان اٹھ گیا بلکہ اپنے مذہب پر سے بھی ایمان جاتا رہا۔ اس وقت سے میں لامذہب ہوں۔ مگر کسی بھی مرحلے پر میں نے پاکستان کے خلاف یا مسلمانوں کے خلاف کسی بدنیتی کا اظہار نہیں کیا۔

اگر مذہب آپ کو اس درجے کی درندگی کے اجازت دیتا ہے تو میں نے جانا کہ جب اصل زندگی کی بات ہوتی ہے تو مذہب کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ ہر کسی کے مذہبی جذبات بدی کرنے کے لئے ابھرے ہوئے تھے اور ان سب نے ایسا ہی کیا۔ میں نے ایک طرف اللہ اکبر کے نعرے سنے تو دوسری طرف ست سری اکال اور ہر ہر مہادیو کے نعرے سنے۔ سب کے جذبات مشتعل تھے، ان کے بھی جو ہندو مت اور سکھ مت کی حفاظت کر رہے تھے اور ان کے بھی جو اسلام کی حفاظت کر رہے تھے۔ مجھے تو سچ مچ ایسا محسوس ہوا کہ پورا ملک ختم ہو جائے گا۔

انسانوں کا قتل لاہور میں روز کا معمول تھا۔ اس کا آسان ترین نشانہ سکھ تھے کیونکہ ان کی پہچان آسانی سے ہو جاتی تھی۔ شر پسند صرف یہ کرتے کہ سڑک پر ایک رسی بچھا دیتے اور جب کسی سکھ سائیکل سوار کو آتا دیکھتے تو رسی کو اونچا کر دیتے۔ سائیکل سوار گر جاتا وہ اس کی طرف دوڑتے، اسے چھرے گھونپتے اور پھر غائب ہو جاتے۔ مجھے وہ رات بھی یاد ہے جب آر ایس ایس کے رضا کاروں نے ایک مسلم اکھاڑے پر حملہ کر دیا۔ یہ لڑکے ذرا زیادہ منظم تھے۔ اچانک گولیاں چلنے کی آواز سنی گئی، عام طور پر وہ چھریاں اور خنجر استعمال کرتے تھے۔ ساری چیخ و پکار ایک دو منٹ میں ختم ہو گئی۔ اگلی صبح پتہ چلا کہ انہوں نے چار پانچ مسلمان پہلوانوں کو مار ڈالا ہے۔

میں 1947 میں اگست کے دوسرے ہفتے تک لاہور میں ہی تھا مگر پھر وہاں مزید ٹھہرنا ناممکن ہوگیا۔ ہم 10 اگست کے آس پاس پولیس کی حفاظت میں لاہور سے نکل پڑے۔ میں نے اپنے خاندان کو کسولی میں چھوڑا اور خود دہلی چلا گیا یہ دیکھنے کے لئے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کہاں جانا چاہیے؟ وہ سفر میرے لئے آج بھی ناقابل فراموش ہے کیونکہ جرنیلی سڑک پر، جہاں عموماً خاصی گہما گہمی ہوتی تھی، اس روز مجھے ایک انسان بھی دکھائی نہ دیا۔ یہ بڑا ہی خوفناک منظر تھا۔ جب میں دہلی سے تیس میل کے فاصلے پر پہنچا تو مجھے ایک جیپ دکھائی دی۔ میں اس کے قریب پہنچا تا کہ دیکھ سکوں اس میں کون لوگ ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اس میں پانچ چھ سردار بیٹھے تھے اور ان سب نے رائفلیں اور خدا جانے کیا کیا اسلحہ سنبھال رکھا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے بڑے فخر سے جواب دیا کہ انہوں نے آس پاس کے تمام دیہاتوں کو مسلمانوں سے پاک کر دیا ہے۔ خوف کی ایک لہر میرے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ یہی کچھ میں نے وہاں ہوتے دیکھا جواب پاکستان ہے۔ میں ایک ٹرین کے قتل عام میں بال بال بچا۔ سکھوں کو سڑک پر دیکھ کر میں سخت خوفزدہ ہوگیا۔ پھر یہی کچھ جب میں نے دہلی میں دیکھا تو میرا دل بالکل ہی ٹوٹ گیا۔

اور پھر آزادی کا جوش و جذبہ چھا گیا۔ میں 14 اگست کو پارلیمنٹ ہاوس کے باہر موجود تھا جہاں میں نے نہرو کی مشہور تقریر سنی۔ پورا مجمع بھارت ماتا کی جے، گاندھی کی جے کے نعرے لگا رہا تھا۔ اگلی صبح میں برطانیہ کا جھنڈا اترنے اور بھارت کا ترنگا لہرانے کا نظارہ دیکھنے لال قلعے کے باہر کھڑا تھا۔ ہر طرف بڑا جوش و جذبہ تھا اور کچھ دیر کے لئے تو مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں لاہور میں اپنا گھر اور اس کا تمام سامان کھو چکا ہوں۔

اس سارے منظر میں بہت کم نمایاں افراد موجود تھے۔ ایک گاندھی تھا جو خود ایک عجیب شخصیت تھا۔ اور نہرو تھا جو خود لامذہب تھا۔ جن دنوں میں دہلی میں تھا، میں نے نہرو کو بغیر محافظوں کے لڑائی والے علاقوں میں اکیلے گھومتے اور بلوائیوں کو اپنے ہاتھوں سے روکتے دیکھا۔ مجھے یاد ہے ایک روز پوری

شام اس نے فسادات روکنے کے لئے سڑکوں پر گزاری جب کہ لوگ یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ ایسا کرے۔ ایک شام جب وہ بہت تھک گیا تھا اور اسے پیاس لگی تھی، کوئی شخص اس کے لئے پانی لے کر آیا۔ وہ وہیں سڑک کے کنارے بیٹھ گیا اور رو پڑا۔

قتل عام کے دنوں میں آپ کے اپنے گاؤں کے لوگ کبھی آپ پر حملہ نہیں کرتے تھے، ہمیشہ باہر کے لوگ آتے اور قتل و غارت کرتے۔ آج بھی ہماری دوستیاں قائم ہیں۔ مثال کے طور پر میرے مسلمان دوستوں نے میرا سارا فرنیچر اور سامان، حتیٰ کہ وہسکی کی آدھی خالی بوتلیں بھی محفوظ رکھیں اور سرحد پار بجھوائیں۔ اگر پیچھے مڑ کر دیکھوں تو میں یہی کہوں گا کہ ہم نے بڑی امیدوں اور عظیم جذبے کے ساتھ اپنا سفر شروع کیا تھا کہ ہم دنیا کو دکھائیں گے کہ گاندھی کی غربت زدہ زمین، عظمت کی بلندیوں کو چھو سکتی ہے۔ مگر چند ہی سال میں یہ جذبے تحلیل ہونے لگے۔ پہلے گاندھی قتل ہو گیا اور پھر ہم نے اس

ملک میں فرقہ واریت کو بڑھتے دیکھا۔ ہمارا خیال تھا کہ فرقہ واریت ختم ہو چکی ہے، اب یہ دوبارہ کبھی سامنے نہیں آئے گی۔ مگر دیکھئے کہ یہ کیسی بری شکل میں سامنے آئی ہے اور پھر ہم نے بھنڈرانوالے کا تماشہ دیکھا۔

اب اس میں وہ ہندو بنیاد پرستی بھی شامل کر لیجئے جو بابری مسجد کے ڈھائے جانے کے ساتھ اپنے عروج کو پہنچ چکی ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا کوئی واقعہ ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ نہرو بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ اس ملک میں ایسا کچھ ہو سکتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس ملک میں فرقہ واریت کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو چکا ہے۔

میں کہوں گا کہ ہماری ترجیحات غلط ہیں۔ ہم نے اپنی دفاعی قوت کو اتنا بڑھا لیا ہے اور بہت سی چیزیں جو فوری توجہ کی طالب تھیں، نظر انداز ہو گئی ہیں اور اس وجہ سے ملک کو تباہی کا سامنا ہو سکتا ہے۔ انڈیا اور پاکستان دونوں مسلسل آئندہ جنگ کے لئے تیاری کر رہے ہیں اور ہمارے تمام وسائل اسی مقصد کے حصول میں صرف ہو رہے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ کب ایک نئی جنگ چھڑ جائے اور ہم اس صورتحال میں پھنس کر رہ جائیں۔ ہمارے پاس ایسی قیادت نہیں ہے جو ہمیں ان مسائل سے نکلنے میں مدد دے سکے۔ مسز اندرا گاندھی کے بعد ہمارے ہاں ایسا کوئی وزیر اعظم نہیں آیا جو ہمیں ہوشمندی کی راہ پر لے جائے لیکن مسز گاندھی نے بھی جمہوری اداروں کو کمزور کیا اور بڑے پیمانے پر کرپشن انہی کے زمانے میں شروع ہوئی۔ ہم ان چیزوں کو کبھی روک نہیں سکے۔ اب ہمارے پاس ایسے راہنما ہیں جو بڑی بڑی تقریریں تو کرتے ہیں مگر کام کچھ نہیں کرتے۔

1984ء کے فسادات میں بھی اسی طرح کے بربریت اور وحشیانہ پن دہرایا گیا اور وہ بھی کسی معقول وجہ کے بغیر۔ دو سکھوں نے مسز گاندھی کو قتل کر دیا اور اسکا بدلہ پورے شمالی ہندوستان کے تمام سکھوں سے لیا جانے لگا اور بدترین بات یہ کہ پولیس پاس کھڑی یہ سب تماشہ دیکھتی رہی۔ اس وقت مجھے تقسیم

کے وقت کے فسادات یاد آئے۔ سب کچھ ویسا ہی ہو رہا تھا سوائے اس کہ فسادات ذرا جدید نوعیت کے تھے۔ چھرا گھونپنے یا گولی مارنے کے بجائے انہوں نے پٹرول اور مٹی کا تیل استعمال کیا اور انہیں زندہ جلا ڈالا۔ اور اس کی سزا کیا ہے۔ بھگت اور سجن کمار کے طرح بہت سے لوگ ہیں جو فخر سے پھرتے ہیں جیسے انہوں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔

پھر بھی، اس کے باوجود۔ میرے اندر کوئی ایسی چیز ہے جو مجھ سے یہ کہتی ہے یہ یہ سب کچھ جاری نہیں رہ سکتا۔ بہت جلد نئی نسل یہ دیکھے گی کہ انہیں بری طرح مایوس کیا گیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ جلد ہی ہم ایسے لیڈر دیکھیں گے جو زیادہ قابلیت رکھتے ہوں گے اور زیادہ مخلص ہوں گے۔ میرے پاس اس کے لئے کوئی ثبوت نہیں ہے۔ یہ صرف میری خوش امیدی ہے کہ حالات اس سے زیادہ برے نہیں ہو سکتے۔

——— خشونت سنگھ

''ہم تو مریں گے یار کی دیوار کے تلے''

ملک کا بٹوارہ ہوا تو میں پانی پت سے میٹرک پاس کرنے کے بعد علیگڑھ گرلز کالج میں فرسٹ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔ میرے بھائی خواجہ اظہر حسن سینٹ سٹیفن کالج دہلی سے بی اے کر رہے تھے۔ جب کالج ہنگامی حالات کے پیش نظر بند کر دیا گیا تو سب مسلمان طلبہ کو نظام پیلس کیمپ میں منتقل کر دیا گیا۔ اظہر کیمپ سے نکل کر کسی نہ کسی طرح میرے پاس علیگڑھ پہنچ گیا۔ نہ پہننے کو کپڑے تھے اور نہ جیب میں کوئی پیسہ۔ اسکی یہ محبت، اپنی بہن سے یہ لگاؤ، یہ ایثار میں کبھی نہیں بھول سکی۔ اسنے اپنے پاکستان جانے کے کئی مواقع کھوئے اور اپنی چھوٹی بہن کو تحفظ دینے کی خاطر میرے پاس آ گیا۔ دس پندرہ دن بعد بریلی سے لاہور ایک اسپیشل ٹرین چلنے کی خبر ملی۔ علیگڑھ میں میرے والد کے ایک بہت دیرینہ دوست، میر ولایت حسین صاحب کی فیملی کے ہمراہ ہم بریلی گئے اور وہاں سے بذریعہ ٹرین لاہور پہنچ گئے۔

حمید نظامی صاحب، ایڈیٹر نوائے وقت، ہمارے کزنز ڈاکٹر شبر حسن اور ڈاکٹر مبشر حسن کے بہت قریبی دوست تھے۔ نظامی صاحب پانی پت آئے تھے، سوان سے ہمارا بھی تعارف تھا۔ لاہور پہنچے تو ہمیں صرف انکا نام اور ایڈریس معلوم تھا، ہم نے تانگہ والے سے کہا کہ نوائے وقت کے دفتر لے چلو۔ تانگہ وہاں پہنچا تو حمید نظامی صاحب ہمارے ہمراہ تانگہ میں آ کر بیٹھ گئے اور ہمیں وہاں لے گئے جہاں ہمارے ماں باپ اور عزیز رشتے دار ٹھہرے ہوئے تھے، وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ سب لوگ ہمارے لئے فاتحہ پڑھ چکے ہیں۔

چار سال پہلے لاہور میں اظہر کا انتقال ہو گیا۔ وہ میرا بھائی تھا، میرا دوست تھا اور میرا بچپن کا ساتھی۔

یہ میرا انڈیا سے پاکستان کا سفر تھا۔ ہم دونوں، بہن بھائی اپنے ماں باپ کے وہ خوش قسمت بچے تھے جو اللہ کی مہربانی سے ان سے آن ملے۔ ایک عرصے تک ہمارے گھر میں سونے کے لئے چارپائیاں نہیں تھیں۔ ہم سب ایک پرانی دری پر اپنی رات بسر کرتے تھے۔ ہمارے علاوہ اور بھی پانی پت کے بہت سے مہاجرین ہمارے گھر اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہاں یہ کہانیاں بیان ہوتی رہتی تھیں کہ ان سب پر اور میرے ماں باپ پر پانی پت میں کیا گزری۔ 54 سال گزرنے کے بعد یہ کہانیاں ابھی پرانی نہیں ہوئیں۔ وہ بوڑھے جو یہ خون اور آگ کا دریا پار کر کے یہاں پہنچے تھے وقت سے پہلے ہی مر گئے۔ وہ بچے جو یہاں آ کر جوان ہوئے اور وہ جوان جواب بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکے ہیں، انکے ذہن میں یہ واقعات یوں لگتا ہے کل کی بات ہے۔

14 اگست 1947 شام ہوتے ہی پانی پت میں سب لوگ اپنے اپنے ریڈیو کھول کر بیٹھے ہوئے تھے، جن گھروں میں ریڈیو نہیں تھے وہ آس پاس کے ان گھروں یا پھر بازار میں دکانوں کے اردگرد جمع ہو گئے تھے جہاں ریڈیو تھے، تاکہ ملک آزاد ہونے کا اعلان سن سکیں۔ اس اعلان کے ساتھ ان سب لوگوں کا مستقبل وابستہ تھا، اکثر علاقے کے لوگوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اب انڈیا میں ہیں یا پاکستان میں۔ بارہ بجے آزادی کا اعلان ہوا، اور پانی پت انڈیا کا حصہ قرار دیدیا گیا۔ پانی پت میں رہنے والے مسلمانوں کی سات آٹھ صدی پرانی تہذیب و ثقافت کی جڑیں ہل گئیں۔ پانی پت کی آبادی کوئی چالیس پچاس ہزار کے درمیان ہوگی، اکثریت مسلمانوں کی تھی پر سب لوگ بہت امن، مساوات، خلوص اور دوستی کے ساتھ وقت گزار رہے تھے، ایک دوسرے کے ساتھ عزت واحترام سے پیش آتے تھے۔ اس اعلان کے بعد کہ پانی پت پاکستان کا حصہ نہیں بنا، مسلمان بددل تو ہوئے پر ایک طرح پر امید تھے کہ ہندو اپنی پرانی روایات اور بھائی چارہ نبھاتے ہوئے مسلمانوں کو وطن چھوڑنے پر مجبور نہیں کریں گے۔

ہفتہ دس دن کے اندر اندر آس پاس کے گاؤں میں لوٹ مار اور خون ریزی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میری ماں کا تعلق برست سے تھا۔ یہ سیدوں کا گاؤں تھا، پانی پت سے سات آٹھ کوس کا فاصلہ ہو گا۔ پانی پت شہر کے چاروں طرف ہندو آبادی تھی، جاٹوں نے حملہ کیا اور وہاں کے لوگ چھکڑوں میں بیٹھ کر پانی پت آنے شروع ہو گئے۔ اسوقت وہ پانی پت کو ایک محفوظ مقام تصور کر رہے تھے۔ ہمارے گھر جو پندرہ بیس لوگوں کا قافلہ پہنچا وہ ہماری ماں کی پھوپھی کا گھرانہ تھا، وہ اس طرح روتے پیٹتے گھر میں داخل ہوئے کہ سب کے دل دہل گئے۔ تفصیلات بیان کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ جب وہ اپنے گاؤں سے پانی پت آ رہے تھے تو راستے میں انکی بہلی پر جاٹوں نے حملہ کر دیا وہ جو کچھ نقدی اور زیور ساتھ لے کر چلے تھے وہ لوٹ لیا گیا۔ گاؤں کے دو جوان لڑکے چھرا گھونپ کر مار دیے گئے انکی لاشیں وہیں چھوڑنی پڑیں انکی سولہ سالہ لڑکی اور ایک جوان بہو جو سات ماہ کی حاملہ تھی، جاٹ انہیں اغوا کر کے لے گئے۔ ہمارے والد نے یہ سنکر انہیں اتنی لعنت ملامت کی کہ تم بے شرم لوگ اپنی بیٹی اور بہو ان کے حوالے کر کے آ گئے۔ اگلے روز پھوپھی کیجو کا بیٹا اور داماد اس گاؤں جانے کیلئے تیار ہو گئے جہاں یہ واردات ہوئی تھی۔ گاؤں پہنچ کر دونوں لڑکے ایک درخت پر چڑھ کر بیٹھ گئے، رات درخت پر گزاری، صبح ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ مرد اپنی چھریاں لہراتے مزید لوٹ مار کرنے کے لئے گھروں سے نکل رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک مہترانی کو اپنا ٹوکرا سر پر رکھے باہر نکلتے دیکھا۔ انہوں نے مہترانی سے یہ معلوم کیا کہ دونوں لڑکیاں کس گھر میں ہیں۔ ایک پرچہ لکھ کر دیا کہ کسی طرح ان لڑکیوں تک پہنچا دو، مہترانی کا پرچہ پہنچانے کے بعد گھر کی عورتوں نے دونوں لڑکیوں کو نہ صرف آزاد کیا بلکہ باہر تک بحفاظت پہنچا کر گئیں۔ شام تک وہ دونوں لڑکیاں ہمارے گھر پہنچ گئیں اور خدا کا شکر ہے کہ بخریت تھیں۔ ایک کے بعد دوسرے گاؤں پر یہی افتاد پڑنی شروع ہو گئی اور پانی پت میں مسلمان مہاجر جمع ہونے شروع ہو گئے۔

سیلاب کی مصیبت نے بے گھر لوگوں کی پریشانی میں مزید اضافہ کر دیا۔ کچھ لوگ اپنے عزیز رشتے داروں اور جاننے والوں کے گھر آ گئے، کچھ نے امام باڑے اور مساجد میں پڑاؤ ڈال لیا۔ سیلاب کے

مصیبت کیا کم تھی کہ ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی، کہاں کا ڈاکٹر اور کہاں کی دوا۔ پانی میں سے گزر کر جنازہ دفن کرنا بھی پل صراط سے گزرنے کے برابر تھا۔ عزیز رشتے دار مرنے والے کا جنازہ امام باڑے یا مسجد کے دروازے پر رکھ کر بھاگ جاتے تھے۔ ہمارے ایک پھوپھا مولوی محمد علی حیدر تھے، بہت عبادت گزار اور خدا ترس ہستی تھے۔ انہوں نے ایک ٹیم تشکیل دی اور یہ سوشل ورک سنبھال لیا کہ وہ مرنے والوں کو انکی آخری منزل تک پہنچائیں۔ ادھر مسلمانوں کے کیمپ بھر رہے تھے دوسری طرف ہندو اور سکھ ترک وطن کر کے مشرقی پنجاب پہنچ رہے تھے۔ انکی رہائش کا مسئلہ بہت سنگین صورت اختیار کر گیا تھا۔ شہر کے مسلمان ابھی تک اپنے گھر چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے، آخر کار ہندوؤں کا ایک وفد شہر کی انتظامیہ کے پاس یہ درخواست لے کر گیا کہ مسلمانوں کو یہاں سے نکالا جائے تا کہ ہندو اور سکھ شرنارتھیوں کیلئے جگہ خالی ہو۔ چنانچہ مسلمانوں کو اپنے اپنے گھروں سے نکل جانے کا حکم سنا دیا گیا۔ پانی پت کے ہندو ابھی بھی اپنا بھائی چارہ نبھا رہے تھے، لیکن باہر سے آنے والے ہندو اور سکھوں نے مسلمانوں کے گھروں پر لوٹ مار اور خون خرابہ شروع کر دیا۔ اب گھر چھوڑنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا، مسلمانوں کے کیمپ بنا دیے گئے۔ سالار گنج کے آس پاس بہت بڑا میدان تھا، سب سے بڑا کیمپ وہاں بنا۔ کیمپ کیا تھا ایک کھلے میدان میں آسمان کے نیچے لوگ اپنی اپنی پوٹلیاں اور گٹھریاں لئے بیٹھے تھے۔ ان سب کی حالت قابل رحم تھی کسی کو کل کا پتہ نہ تھا ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ ایک روز اطلاع ملی کہ گاندھی جی کیمپ کا معائینہ کرنے آرہے ہیں۔ گاندھی جی مع اپنے سکھ سکریٹری اور دوسرے عملے کے ساتھ تشریف لائے اور مسلمانوں کے کیمپ میں جانے کا عندیا ظاہر کیا۔ پانی پت حفاظِ قرآن اور صوفیائے کرام کا شہر تھا۔ وہاں کے لوگ نہ صرف خوددار اور انا پرست تھے بلکہ وہ درویش صفت لوگ تھے جو جان جائے پر آن نہ جائے پر سب کچھ وار دیتے تھے۔ گاندھی جی نے کیمپ کے بے بس اور لاچار لوگوں سے گفتگو کی اور ان کے حوصلے کو بہت سراہا اور یہ کہا کہ آپ لوگ اپنے شہر میں آباد رہیں، آپ لوگوں کو اپنے ماحول اور کلچر کو چھوڑ کر بہت تکلیف ہوگی۔ آپکی جان اور مال کی حفاظت کی جائے گی۔ میرے والد کے ایک کزن خواجہ تہور علی حیدر جو پانی پت کے نامی گرامی وکیل اور ایک اہم شخصیت تھے وہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے گاندھی جی کو مخاطب کر کے کہا کہ ” گاندھی جی ہم تو اسی

روز برباد ہو گئے جب ہمیں ہمارے گھروں سے نکال کر باہر بٹھا دیا گیا۔ اس بے عزتی کے بعد اب ہم اپنے گھروں میں واپس جا کر کیا کریں گے۔ اب ہمارے یہاں رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ ہندوستان کے باپو ہیں آپ ہمیں پانی پت سے اس طرح رخصت کریں جیسے باپ اپنی بیٹی کو گھر سے رخصت کرتا ہے''۔

جو لوگ وہاں موجود تھے انکا کہنا ہے کہ خواجہ تہور علی حیدر سے یہ جواب سننے کے بعد گاندھی جی رونے لگے۔ شام کو گاندھی جی پرارتھنا سبھا میں دلی سے ایک تقریر کر رہے تھے جو ریڈیو سے بھی ریلے ہوتی تھی۔ گاندھی جی نے اپنی اس تقریر میں اپنے پانی پت کے اس دورے کا ذکر کیا اور کہا کہ پانی پت کے لوگ بہت پڑھے لکھے، بہت مہذب اور سمجھدار ہیں اب وہ اپنے وطن نہیں رکنا چاہتے اور پاکستان جانے کے خواہش مند ہیں اسلئے اہل پانی پت کے واسطے اسپیشل ٹرینیں چلانے کا بندوبست کیا جائے۔

ہمارے سب عزیز رشتہ دار محلّہ باغچہ میں رہائش پذیر تھے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ محلّہ باغچہ میں تقریباً سب گھر ہمارے تایا، چچا اور پھوپھی کے تھے۔ میرے ماں باپ محلّہ انصار کے ایک گھر میں رہتے تھے، یہ گھر ایک جدی پشتی گھر تھا، جو ہمارے دادا نے بنوایا تھا، اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد میرے والد اسمیں رہائش اختیار کی اور آس پاس کا علاقہ خرید کر اس گھر کو مزید وسیع اور آرام دہ بنایا۔ یہ دونوں وہ محلے تھے جہاں کے گھروں کو ابھی کیمپ میں منتقل نہیں کیا گیا تھا۔

ہمارے والد مرحوم پاکستان کے مطالبے کو ایک بہتر حل سمجھتے تھے پر ترکِ وطن کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ انکا خیال تھا کہ ہر دو طرف کے لوگ جہاں ہیں وہاں آباد رہیں گے۔

جب اس خطے کے ہندو اور سکھ بے گھر ہو کر پانی پت پہنچنے لگے تو ضلع کے ڈپٹی کمشنر نے ہمارے والد کو بلا بھیجا۔ اسوقت ہمارے والد صاحب پانی پت کے مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے ڈپٹی کمشنر سے ملنے کرنال گئے۔ اور اسکے یہ پوچھنے پر کہ خواجہ صاحب آپ اور آپ کے شہر کے دوسرے مسلمان پاکستان کب جا رہے ہیں؟ ہمارے بادہ یہ جواب دے کر آئے تھے کہ ''ہم تو مریں گے یار کی دیوار کے تلے''۔

اسکے چند دن کے بعد پولیس کے ایک افسر نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا اور یہ سرکاری حکم سنایا کہ آپ لوگوں کے پاس جو اسلحہ ہے، وہ جمع کروادیا جائے۔ میرے باپ نے وہ جائز اسلحہ جو انکی ملکیت تھا اسے دیتے ہوئے ایک چھوٹا سا پستول بھی اسے دکھایا جسکا دستہ ہاتھی دانت کا بنا ہوا تھا اور اس سے پوچھا کہ کیا یہ میں اپنے پاس رکھ سکتا ہوں یہ میرے انگریز ڈپٹی کمشنر نے مجھے بطور انعام دیا تھا جب میں تحصیلدار تھا۔ اسے بہت اطمینان سے کہا "جی ضرور" اگلے روز وہی آفیسر آیا اور کہا کہ جی ہمارے صاحب نے وہ پستول بھی مانگا ہے۔ (پاکستان پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد ہمارے والد صاحب کی بندوقیں یہاں جمع کروا دی گئی تھیں پر وہ پستول واپس نہیں آیا اسکا چمڑے کا خالی کیس شاید کہیں ابھی بھی ہمارے گھر کی کسی

الماری میں پڑا ہوگا) اس واقعہ کے بعد ہمارے والد بہت دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کو نہتا کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اب آپ بے بس ہیں۔
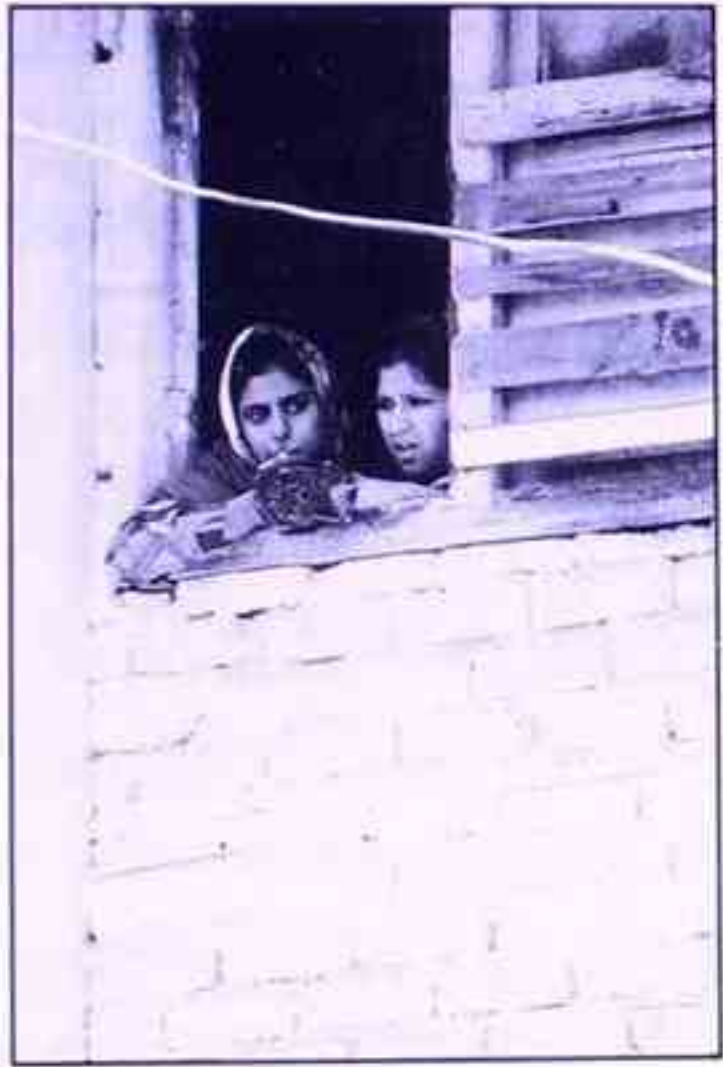
محلہ انصار میں جس روز قتل و غارت شروع ہوا اس روز شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ ہمارے گھر ایک پولیس حوالدار ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا آرڈر لے کر آیا کہ محلہ مخدوم زادگان کو محلہ انصار کے لوگوں کا کیمپ قرار دے دیا گیا ہے۔ چنانچہ فوراً محلہ انصار خالی کر دیا جائے۔ کرفیو کی وجہ سے اہل محلہ تک یہ پیغام پہنچانے کی اسکے علاوہ اور کوئی صورت نہیں تھی کہ ہمارے والد صاحب اپنے گھر کی چھت پر چلے گئے اور چیخ چیخ کر آس پاس کے گھروں میں اعلان کرنے لگا کہ اہل محلہ اپنے گھر خالی کر دیں یہ اعلان ایک چھت سے دوسری چھت پر پہنچایا جانے لگا۔ ہمارے والد صاحب کی اس پر بھی تسلی نہ ہوئی تو وہ محلہ والوں کی محبت میں کرفیو کے باوجود گھر سے نکل کھڑے ہوئے میری ماں کا بیان ہے کہ وہ میری ڈیڑھ سالہ چھوٹی بہن اور میرے چھوٹے بھائی کو لے کر گھر میں تنہا بیٹھی تھیں اور محلہ دار آ کر دروازہ پیٹ رہے تھے کہ خواجہ صاحب سے کہو جلدی باہر نکلیں تا کہ ہم انکے پیچھے چلیں۔ یہ عجیب و غریب منظر تھا، سب مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے اپنا اپنا مختصر سامان سروں پر رکھے سڑکوں پر نکل آئے، اسمیں وہ بزرگ خواتین بھی تھیں جنہوں نے کبھی بازار کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ یہ عزت و ناموس، تہذیب و ثقافت کا جنازہ تھا۔۔ ہندو دکانوں کے تھڑوں اور مکان کے چھتوں پر اس جلوس کا نظارہ کر رہے تھے۔ بقول مصطفیٰ زیدی کے

جدھر جدھر سے بھی گزرا جلوس رسوائی
کھڑے تھے لوگ دریچوں میں شمعداں کی طرح

ہمارے باوا نے اپنے سر پر ایک کالا کاغذوں کا بکس اٹھایا ہوا تھا جسمیں انکے پراپرٹی کے کاغذات تھے۔ غالباً کاغذ زیادہ تھے یا باوا کے پاس اسے بند کرنے کا وقت نہیں تھا اسکے اوپر انہوں نے ایک کمر بند باندھا ہوا تھا۔ یہ ہمارے والد صاحب کا وہی سرکاری کاغذوں کا بکس تھا جو دوران ملازمت انکا اردلی اپنے سر پر اٹھا کر لاتا تھا۔

انگریز حکومت کا بہت حق گو، فرض شناس،، دیانتدار اور خوددار تحصیلدار آج ایک آزاد شہری کے طور پر اپنا گھر چھوڑ کر سڑک پر نکلا تھا۔ اس مجمع میں ایک نکڑ پر ہمارے باغ کا مالی بھی اپنے بیٹے کے ساتھ کھڑا تھا۔ اسنے اپنی پگڑی سر سے اتار کر زمین پر پھینکی اور دہاڑیں مار مار کر رونے لگا، اپنے بیٹے کو دھکا دیا اور کہا "خواجہ صاحب کا بکس لے کر اپنے سر پر رکھ"۔ باوا جان نے انکار کر دیا اور کہا اب یہ بوجھ پاکستان تک مجھے ہی اٹھانا ہے۔ باوا کے پیچھے میری ماں چل رہی تھی۔ میری چھوٹی بہن گود میں تھی اور میرے پانچ سالہ بھائی کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ میرے ماں اور باپ نے اپنے بڑے بچے اپنے عزیزوں کے ہمراہ پہلے روانہ کر دیے تھے۔ یہ غالباً انہوں نے اس لئے کیا ہوگا کہ پاکستان پہنچنے کے بعد کم از کم انکے وہ بچے تو محفوظ ہو جائیں ورنہ وہ بھی اتنے بڑے نہیں تھے کہ بغیر ماں باپ کے رہ سکیں۔

محلہ مخدوم زادگان کے مکینوں نے محلہ انصار کے مسلمانوں کے لئے اپنے گھروں کے دروازے کھول دئے۔ یہ اور بات ہے کہ چند روز کے بعد ان کے گھر بھی لٹ چکے تھے۔ ہمارے ماں باپ اور انکے سب ساتھی ابھی کیمپ میں ہی تھے کہ انکے گھروں کے قفل توڑے جا چکے تھے اور سامان لوٹ لیا گیا تھا۔

تین چار روز کیمپ میں گزرے تھے کہ ہمارے ایک عزیز خواجہ حبیب علی صاحب جو اسوقت انڈیا میں (غالباً شملہ میں) مجسٹریٹ کے عہدے پر تعینات تھے انکا بھیجا ہوا ٹرک پانی پت پہنچ گیا اور خواجہ اختر حسن اپنے بیوی بچوں اور دیگر عزیزوں کے ہمراہ ہمیشہ کے لئے اپنے وطن سے رخصت ہوئے۔

لاہور پہنچنے کے بعد ہمارے والد صاحب نے ٹیلیفون کر کے Evacuee کمشنر کا ایک نمائندہ بلوایا اور جو کچھ پانی پت کے مسلمانوں پر گزری تھی اسے تحریر کروایا۔ میرے باپ کی یہ داستان شاید ابھی بھی حکومت پنجاب کے ریکارڈ میں موجود ہو۔

گاندھی جی کی تقریر کے بعد پانی پت کے لئے اسپیشل ٹرینیں چلنی شروع ہوگئیں اور آخری ٹرین سے خواجہ تہور علی حیدر اپنے دیگر اہل وطن کے ہمراہ پاکستان کے لئے روانہ ہوئے جنہوں نے گاندھی جی سے یہ درخواست کی تھی کہ پانی پت کے مسلمانوں کو عزت کے ساتھ وطن سے رخصت کیا جائے۔ اس ٹرین کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ اسمیں بوعلی شاہ قلندر کے مزار کے وہ مجذوب بھی سوار کروادیے گئے جو برہنہ حالت میں پھرتے تھے اور مزار پر حاضری دینے والے لوگ ان کی بے حرمتی کے خیال سے ان کے تن ڈھانپ دیا کرتے تھے۔ یہ سب کچھ جاننے کے بعد مجھے گاندھی جی واقعی مہاتما کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ میرے والد مرحوم نے پانی پت چھوڑنے کے بعد ہمارے سامنے کبھی بھی پانی پت کا نام نہیں لیا۔ یہ انکے دکھ کی انتہا تھی۔ ہمیں کبھی غریب الوطنی اور مہاجر ہوتے ہوئے بھی کسی محرومی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ جبکہ مجھے یقین ہے کہ وہ مرتے دم تک کبھی پانی پت کو بھلا نہیں سکے۔

اس وقت کے فنانشل کمشنر سید اختر حسین صاحب جو ضلع گڑگانوہ میں میرے والد کے ڈپٹی کمشنر رہ چکے تھے انہوں نے باوا کو منٹگمری (حال ساہیوال) میں سیٹلمنٹ آفیسر لگا دیا تھا اور میرے باوا جو اپنے آفس میں بیٹھکر مہاجروں کو زمین الاٹ کرتے تھے، شام کو گھر آکر بچوں کو یہ درس دیتے تھے کہ خدا کا شکر کرو کہ تم سب زندہ سلامت آگئے ہو۔

جان، مال، آبرو، ہر دو طرف کے لوگوں نے یہ قربانی دیکر آزادی کی قیمت ادا کی۔

یہ میں آپ سے سوال کرتی ہوں کہ اپنی تاریخ، روایات، ثقافت، تہذیب، تمدن یہ سب کچھ گنوانے کے بعد آپکی شناخت کیا رہ جاتی ہے؟ عہدہ، دولت، شہرت اور کیا یہ سب کچھ ختم نہیں ہو جاتا؟

پانی پت کی کہانی سنانے کے بعد میں اپنے والد کو خراج تحسین پیش کروں گی جنکی عمر تقسیم کے وقت ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی انکی جڑیں پانی پت میں کتنی مضبوط ہوں گی اسکا اندازہ میں اسوقت کیسے لگا سکتی تھی۔ ہاں اب 54 سال گزرنے کے بعد جب میری عمر انکی عمر سے تجاوز کر گئی ہے میں یہ سوچ سکتی ہوں۔ میرا فالتو وقت باغبانی میں گزرتا ہے، یہ شوق مجھے ورثہ میں ملا ہے۔ میں اپنے باپ سے پوچھنا چاہتی ہوں "باوا کیا محبت کا پودا ہر زمین پر اُگ جاتا ہے؟ آپ نے یہ فصل تیار کرنے کیلئے کیا کیا تگ و دو نہ کی ہوگی۔ آپکو یہ نئی زمین زرخیز کرنے کے لئے کتنی محنت کرنی پڑی ہوگی" پر میرا باپ اسکا جواب نہیں دے سکتا۔ وہ تقسیم کے تیرہ سال بعد 1960 میں یہ دنیا چھوڑ گئے تھے اور وہ جو پانی پت میں یہ کہتے تھے کہ

ہم تو مریں گے یار کی دیوار کے تلے
مجنوں کو تھا جنوں جو بیاباں کو چلدیا

ہم نے انہیں ساہیوال کے قبرستان میں بہت آرام سے سلا دیا تھا۔

——— میمونہ کلثوم

شعلوں کی لپیٹ میں

لاہور میں اندرونِ شہر کے لوگوں کو آج بھی تقسیم کے دنوں کے خونیں فسادات یاد ہیں......

'وہ ادھر اس مکان کی طرف دیکھو، محمد یعقوب نے کہا جو گنجا ہے اور جس کی عمر ساٹھ برس سے اوپر ہے۔ اس نے ایک دو منزلہ مکان کی طرف اشارہ کیا جو اپنے اردگرد کے بلند و بالا پلازوں کے درمیان خاصا چھوٹا سا دکھائی دیتا تھا۔ ہم شاہ عالم گیٹ پر کھڑے تھے جسے عام لوگ شاہ عالمی بھی کہتے ہیں۔ یہ بارہ دروازوں میں سے ایک ہے جس سے لاہور کے مشہور فصیلی شہر میں داخل ہوا جاتا تھا۔ شاہ عالمی میں تقسیم سے پہلے کے زمانے کے ہندوؤں کی اکثریت آباد تھی۔ ملبے کا ڈھیر کم از کم اتنا اونچا ضرور ہو گیا تھا۔ محمد یعقوب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ وہ ان دنوں کے بارے میں بتا رہا تھا جب شاہ عالمی کو ہندو مسلم فسادات کے دوران مکمل طور پر جلا دیا گیا تھا۔

مجھے یاد نہیں کہ یہ سب کب شروع ہوا، مگر یہ 14 اگست سے بہت پہلے کی بات ہے میں سکول میں پڑھتا تھا اور میرے باپ نے جو گڑ بیچا کرتا تھا ہم سب کو ہدایات کی کہ ہم گھر سے باہر نہ نکلیں۔ مجھے یہ بات سمجھ نہ آئی کہ ایسا کیوں کیا جائے۔ بے شک اس وقت پاکستان کے بارے میں خوب باتیں ہوتی تھیں مگر میں یہ نہ سمجھ پایا کہ پاکستان کا ہمارے گھر سے باہر نکلنے سے بھلا کیا تعلق ہے۔

وہ دن یعقوب جیسے نوعمر بچوں کے لئے یقیناً سخت ذہنی انتشار کے دن ہوتے ہوں گے جو مسلمان تھے اور ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ سکول میں پڑھتے تھے۔ سکول میں ہندو اساتذہ اپنے طالبعلموں کو خواہ

ان کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو یہی بتا رہے تھے کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

اپنی عمر کے دوسرے بچوں کی طرح یعقوب کو تقسیم کے دنوں کے واقعات واضع طور پر یاد نہیں ہیں۔ نہ ہی وہ ان فسادات کو واضح طور پر یاد کر سکتا ہے جو شاہ عالمی میں ہوئے، جو اس وقت بھی شہر کی سب سے بڑی مارکیٹ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میرے والدین بات کیا کرتے تھے کہ فلاں فلاں علاقے میں اتنے ہندو مارے گئے یا اتنے مسلمان مارے گئے۔ میں نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ ایسا شاہ عالمی میں بھی ہو سکتا ہے۔ مگر ایسا ہو گیا اور مجھے ہندوؤں کے مکانات کے ملبے پر چلنا آج بھی یاد ہے۔ ان مکانات کو مسلمانوں نے آگ لگا دی تھی۔ میں اور میرے دوست سارا سارا دن اس ملبے کو کریدتے رہتے کہ شاید اس میں سے کوئی قیمتی چیز مل جائے۔ کبھی کبھی ہمیں کچھ مل بھی جاتا، عموماً یہ برتن ہوتے۔

یعقوب کو بہتر تحفظ میسر تھا لیکن بہت سے دوسرے بچوں کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ ان دنوں کی یادیں مرتے دم تک میرے ساتھ رہیں گی شیخ حنیف نے کہا جو اس زمانے میں میٹرک پاس کر چکا تھا اور جس کا والد شاہ عالمی کے باہر پینٹ بیچا کرتا تھا۔ میرے والد ہندوؤں سے مال خریدتے تھے جو اس زمانے میں زیادہ تر کاروبار کے مالک تھے۔ حنیف نے بتایا۔ ایک دن میرے والد نے مجھے میکلوڈ روڈ پر ایک دکان سے کچھ رقم وصول کرنے کے لئے بھیجا۔ اس دکان کا مالک ایک سکھ تھا اور جب میں دکان کے اندر گیا تو میں نے ایک کونے میں بہت سی تلواریں اور بندوقیں رکھی دیکھیں۔ میرے خیال میں یہ وقت تھا جب مجھے یہ محسوس ہوا کہ کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔

کچھ ہی دیر بعد شیخ حنیف نے خوفناک قتل عام دیکھا۔ " ہمارے گھر کے پچھلی طرف ایک گلی میں سب ہندو رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک رات بہت افراتفری مچی ہوئی تھی۔ ہم سب گھر کی چھتوں پر چڑھ گئے اور میں نے درجنوں ہندو مرد، عورتوں اور بچوں کو گھروں کی چھتوں پر اکٹھے دیکھا۔ وہ سب آس پاس رہنے والے مسلمانوں سے تحفظ کی التجا کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان سب کو مار دیا گیا۔"

پھر بھاٹی گیٹ کے کراؤن سینما میں بم کا دھماکہ ہوگیا۔ اس میں کچھ مسلمان مارے گئے اور اس کے بعد انتقامی قتل وغارت کا سلسلہ چل پڑا۔ یہ بڑے خوفناک واقعات تھے۔ میرا خیال ہے چند دنوں کے اندر اندر پچاس سے زیادہ ہندو مار دیے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دونوں طرف کے مفسدین ایک ہی گلی میں شدید لڑائیاں لڑتے تھے۔ شاہ عالمی کی گلیاں اس زمانے میں اتنی تنگ ہوتی تھیں کہ دو تندرست افراد ایک ساتھ آسانی سے گزر نہیں سکتے تھے۔

تاہم شیخ حنیف کا کہنا ہے کہ اس پاگل اور تشدد کے دور میں بھی دونوں مذہبی گروہوں میں کوئی عمومی دشمنی موجود نہیں تھی اور وہ ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے۔ دونوں طرف ایسے لڑاکے تھے جن سے عام لوگ ڈرتے تھے۔ ہر کوئی ان سے سہا ہوا تھا۔ ہم سب ایک جیسے ہی دکھائی دیتے تھے کیونکہ ہم ایک جیسے کپڑے پہنتے تھے۔ شلوار اور قمیض۔ اس لئے جو کوئی بھی رات کو اکیلا باہر نکلتا، ہندو ہو یا مسلمان، ان

فساد کرنے والوں کا نشانہ بنتا۔ شیخ حنیف کا خیال ہے کہ زیادہ تر ہندو جو تقسیم سے پہلے انڈیا چلے گئے تھے انہوں نے بلوائیوں سے بچنے کے لئے ایسا کیا تھا اور وہ مستقل طور پر ہجرت نہیں کرنا چاہتے تھا" ایک ہندو تاجر میرا جاننے والا تھا۔ اس نے جاتے ہوئے اپنی دکان اور مکان کی چابیاں مجھے دے دیں۔ اس کا ارادہ تھا کہ جیسے ہی حالات معمول پر آئے وہ واپس آ جائے گا۔"

ظفر، ایک اور لڑکا جو اس زمانے میں اسکول میں پڑھتا تھا، تقسیم سے بمشکل ایک ہفتہ پہلے لاہور آ گیا تھا۔ مگر جب تک اس کا خاندان شاہ عالمی پہنچا وہاں آگ لگائی جا چکی تھی۔ قطاروں کی قطاریں جلے ہوئے اور برباد مکانات دکھائی دیتے تھے اب گلبرگ میں اپنے آرام دہ ائر کنڈیشنڈ دفتر میں بیٹھے ہوئے یاد کرتا ہے۔ "اپنے نئے آس پڑوس کو دیکھنے کے لئے میں گھر سے نکلا اور ابھی چند گز ہی چلا ہوں گا کہ میں نے ایک چھوٹے سے اور تیز مسلمان شخص کو ہاتھ میں چاقو لئے ایک لمبے چوڑے سکھ لڑکے کا پیچھا کرتے دیکھا۔ میں جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہ گیا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچ سکتا، مسلمان سکھ کے پاس پہنچ چکا تھا اور اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ چکا تھا۔ سکھ بغیر کوئی آواز نکالے نیچے گرتا چلا گیا۔ میں یہ دیکھ کر دہشت زدہ ہو گیا۔"

اس سارے قتل و غارت کے دوران مسلمانوں کی ہندوؤں پر مظالم کی بہت سی کہانیاں موجود ہیں اور اتنی ہی کہانیاں مسلمانوں کی ہندوؤں کے ساتھ فراخدلی کی بھی ہیں۔ جیسا کہ غیر تحریر شدہ تاریخ کے ساتھ عموماً ہوتا ہے، اس میں فسانے کو حقیقت سے الگ کرنا ناممکن ہے۔ ان داستانوں میں کوئی بھی گم ہو سکتا ہے۔

——— عامر اے خان

مجھے جلتا ہوا لاہور آج بھی یاد ہے

ایک سابق سفارت کار ان واقعات کو دہراتے ہیں جو لاہور کے تاریخی شہر میں رونما ہوئے۔ کہتے ہیں کہ آج پاکستان اور انڈیا کے لوگوں کی سرحد پار آمد ورفت زیادہ ہونی چاہیے۔

مجھے وہ خوفناک دن واضح طور پر یاد ہیں جب لاہور، وہ شہر جہاں میں پیدا ہوا، پلا بڑھا، جل رہا تھا اور مر رہا تھا جبکہ برطانوی حکمران برصغیر کی تقسیم اور اقتدار ہندوستان والوں کے ہاتھوں میں منتقل کرنے کے معرکتہ الآرا کام میں مصروف تھے۔ انڈیا کے پہلے وزیراعظم، نہرو کے نزدیک، خود ان کے اپنے الفاظ میں، آزادی "تقدیر کے ساتھ ایک معرکہ" تھا۔ جناح کے نزدیک یہ ان کے اس خواب کی تعبیر تھی کہ مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن، پاکستان، حاصل کیا جائے۔

لاہور ایک وسیع ماضی ہے۔ شائد برصغیر کے کسی بھی دوسرے شہر کی تاریخ لاہور سے زیادہ گنجلک نہیں۔ یہ وہ شہر ہے جس پر ہندو راجاؤں، مغل شہنشاہوں، سکھ بادشاہوں اور برطانوی حکمرانوں نے حکومت کی۔ برطانوی نوآبادی کے ایک صوبے کے صدر مقام اور نظم ونسق کے جدید نظام کے مرکز کے طور پر لاہور ہندوستانی نوآبادی کا ایک ایسا اہم قلعہ ثابت ہوا جو افغانستان اور روس کی سرحد پر نظر رکھتا تھا۔ اپنے کالجوں اور فنی تعلیمی اداروں کی وجہ سے لاہور شمالی ہندوستان میں تعلیم کا مرکز تھا۔ یہاں تک کہ دہلی سے طلباء تعلیم کے لئے لاہور آیا کرتے۔ اس شہر کو مشرق کا پیرس کہا جانے لگا۔ یہاں کے لوگ فیشن کے شوقین تھے اور ان کا انداز زندگی، عادات اور رہن سہن سب سے زیادہ قابل تعریف سمجھی جاتی تھیں۔ یہ شہر تجارت اور سیاست کا بھی مرکز بن چکا تھا۔

تاریخی قوتوں کے باہمی عمل نے ملک بھر کے لوگوں کی نسبت پنجاب کے مسلمانوں کو کم شدت پسند اور یہاں کے سکھوں اور ہندوؤں کو کم قدامت پرست بنا دیا تھا۔ یہ تینوں مذہبی گروہ ایک مشترکہ پنجابی ثقافت کے تحت، جو اس صدی کی ابتدائی دہائی سے پھل پھول رہی تھی، ایک دوسرے کے ساتھ آزادی سے ملتے جلتے تھے اور ان کے تعلقات بہت دوستانہ تھے۔ تقریباً ایک ہزار برس سے زیادہ عرصے سے مسلمانوں کی برصغیر میں موجودگی کے اثرات دوسرے مذاہب کے شہریوں کے لباس، رسوم ورواج، کھانوں، زبان اور یہاں تک کہ ان کے ناموں پر بھی دکھائی دیتے ہیں۔

برطانوی حکومت کی طرف سے جون 1948 تک ہندوستان چھوڑ کر چلے جانے کے فیصلے کا اعلان پنجاب کی صورتحال میں تباہ کن ثابت ہوا۔ مسلم لیگ نے یونینسٹ پارٹی کے رہنما، خضر کے خلاف راست اقدام کی تحریک شروع کر دی کیونکہ اس نے ہندو تنظیم آر ایس ایس (راشٹریہ سیوک سنگھ) کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ کی نیم فوجی تنظیم مسلم لیگ نیشنل گارڈ پر پابندی عائد کر دی تھی۔ مسلم لیگ کے رہنماؤں نے سرکاری احکامات توڑے اور گرفتاریاں دیں اور لاہور میں ہڑتالیں ہوئیں۔ خضر کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ مسلم لیگ کی شرائط مان لے اور پابندی اٹھا لے لیکن اس نے برافروختہ ہو کر 3 مارچ

1947 کو استعفیٰ دے دیا۔ پنجاب کے گورنر ایون جینکنز مسلم لیگ کی وزارت کے قیام کا جائزہ لے رہے تھے۔ جس وقت وہ نواب ممدوٹ کی ساتھ ملاقات میں مصروف تھے، ایک اکالی لیڈر ماسٹر تارا سنگھ قانون ساز اسمبلی کے باہر تلوار لہراتا اور پاکستان مردہ باد کے نعرے لگاتا رہا۔ اس کے بعد ہی ہندوؤں اور سکھوں نے پاکستان مخالف مظاہرے شروع کر دیے جس سے لاہور سے لیکر دوسرے قصبوں اور دیہات تک فسادات چھڑ گئے۔ فسادات نے بداعتمادی اور نفرت کی ایک فضا قائم کر دی جس میں پولیس تک فرقہ وارانہ بنیادوں پر تقسیم ہو چکی تھی۔ پورے کے پورے گاؤں تہ تیغ کر دیے گئے جس کے بعد انتقاماً اور جواباً دوسرے مذہبی گروہ نے بھی قتل عام کیا۔

3 جون 1947 کے برطانوی منصوبے کے مطابق، یہ فیصلہ کیا گیا کہ بنگال اور پنجاب کو تقسیم کر دیا جائے اور انتقالِ اقتدار کی تاریخ 15 اگست 1947 کر دی گئی۔ تاریخ پہلے کر دینا ایک غیر دانشمندانہ فیصلہ تھا جس نے تقسیم کے وقت ہونے والے مذہبی فسادات میں اہم کردار ادا کیا۔ جون 1947 میں سیاسی تنظیموں کے نیم فوجی دستوں کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہوا۔ مسلم لیگ نیشنل گارڈز کی تعداد 39,000 بتائی جاتی ہے جبکہ آر ایس ایس میں 58,000 سے زیادہ اور سکھ اکالی فوج میں 8,000 افراد شامل تھے۔ جولائی کے وسط تک سینکڑوں غیر مسلموں کے گھر جلائے جا چکے تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے جواباً مسلمانوں کے گنجان آباد علاقوں پر بم پھینکے۔ ہندوؤں اور سکھوں کے ترکِ وطن کا سلسلہ جو اپریل سے شروع ہو چکا تھا اب اپنے زوروں پر تھا۔ انہوں نے اپنی املاک کو تالے لگائے اور چلے گئے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ امن و آشتی کی بحالی کے بعد حالات درست ہو جائیں گے اور وہ واپس لوٹ آئیں گے۔ مگر ایسا ہونا تھا نہ ہوا۔ انگریز حکمرانوں نے 15 اگست 1947 کو ہندوستان کو تقسیم کیا اور یہاں سے چلے گئے۔ سر سیرل ریڈ کلف کی سرکردگی میں قائم کیے گئے حد بندی کمیشن نے، جس کی ذمہ داری حد بندی لائن کا تعین کرنا تھا۔ 12 اگست کو اپنا فیصلہ وائسرائے کے سامنے پیش کر دیا اور اس کا اعلان 16 اگست کو کیا گیا تا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں یوم آزادی کی خوشیاں درہم برہم نہ ہوں۔

میں نے واقعات کا سارا سلسلہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ تقسیم کا خوفناک منظر تو سامنے تھا مگر ہم نے کبھی لاہور چھوڑ کر چلے جانے کا نہیں سوچا تھا چاہے وہ پاکستان کا حصہ ہی کیوں نہ بن جائے۔ ہندوؤں کو امید تھی کہ شائد لاہور ہندوستان میں شامل کیا جائے۔ میں نے لاہور مارچ میں چھوڑا جب شہر کے کچھ حصوں میں فسادات شروع ہو گئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دہلی جانے والی ٹرین کھچا کھچ بھری ہوئی تھی حالانکہ کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ میرا لاہور کا آخری سفر ہوگا۔ جب اپریل اور مئی میں حالات مزید بگڑتے گئے اور تعلیمی ادارے موسم گرما کی چھٹیوں کے لئے بند ہو گئے تو میرے بھائی اور بہنیں بھی میرے پاس دہلی آگئے۔ میرے والد نے اپنی سرکاری ملازمت میں پاکستان میں کام کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی کیونکہ ان کا لاہور چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ اپنے دفتر سے تانگے پر سوار واپس آرہے تھے تو ایک ہجوم نے ان پر حملہ کر دیا اور وہ بال بال بچے۔ خوش قسمتی سے اس ہجوم میں سے کسی نے انہیں پہچان لیا اور انہیں اپنے ساتھ گھر پہنچایا۔ وہ میری والدہ کے ساتھ اگست کے وسط تک لاہور میں ہی رہتے رہے لیکن 14 اگست کو ان کے کچھ دوستوں نے انہیں خطرات سے خبردار کیا اور پرزور طریقے سے یہ مشورہ دیا کہ وہ کچھ دنوں کے لئے لاہور سے چلے جائیں اور بعد میں حالات بہتر ہوں تو واپس آجائیں۔ انہوں نے میرے والدین کو ریلوے اسٹیشن پہنچایا اور کسی طرح انہیں ریل کے ایک ایسے کمپارٹمنٹ میں سوار کرا دیا جس میں انگریز فوج کے افسران سوار تھے۔ ان انگریز افسروں نے انہیں اپنی سیٹوں کے نیچے چھپنے کی جگہ دی۔ یہ لاہور سے روانہ ہونے والی آخری ٹرین تھی کیونکہ اس کے بعد ٹرین سروس معطل کر دی گئی تھی۔

پچاس برس گزر گئے مگر ہمارے ذہن میں یہ سب باتیں اب بھی تازہ ہیں اور ہم میں سے زیادہ تر لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم اپنی جڑوں سے جدا ہیں۔ ہم آج بھی اپنی شناخت کی تلاش میں ہیں۔ ہمیں خود کو نئے لسانی اور سماجی ماحول میں ڈھالنا پڑا۔ ہم اس وقت کے سیاسی رہنماؤں سے اپنی مایوسی کا اظہار کیے بغیر اور انہیں اپنے مصائب کا ذمہ دار ٹھہرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ ستم ظریفی کی بات ہے کہ مہاتما گاندھی نے اگست کے پہلے ہفتے میں لاہور کی غیر مسلم آبادی سے کہا کہ وہ وہیں رہتے رہیں جبکہ اس وقت تک شہر سے غیر مسلموں کی نصف سے زیادہ آبادی نقل مکانی کر چکی تھی۔ بے حساب جانی و مالی نقصان جو تقسیم کے وقت ہوا اور اس کے پچاس برس گزرنے کے دوران جو سرد جنگ برصغیر میں جاری رہی اس کا اندازہ سیاسی رہنما نہیں لگا سکتے۔

بدقسمتی سے ہندوستان اور پاکستان، جن کا مشترکہ ورثہ اور سماجی و ثقافتی روایات صدیوں پرانی ہیں، آج بھی ایسے پڑوسی ہیں جن کے درمیان بڑا فاصلہ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ہم نے کس جوش و جذبہ سے دہلی میں منعقد ہونے والے سالانہ پاک و ہند مشاعرے میں پاکستان سے آنے والے شرکاء کا خیر مقدم کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ کس طرح ایک مرتبہ پاکستان کے نمایاں شاعر حفیظ جالندھری نے سیاست دانوں کو بیڑا غرق کرانے والے کہا تھا اور شاعروں اور ادیبوں سے کہا تھا کہ وہ عام لوگوں کے درمیان دوستی کا ناطہ پھر سے قائم کریں۔

یہ بات اہم ہے کہ پنجابیوں کے سرحد پار کے لوگوں کے ساتھ مشترکہ ورثے اور نسلی تعلق کو تسلیم کیا جائے۔ اگرچہ پنجاب کے دونوں حصوں میں درحقیقت کوئی منقسم خاندان موجود نہیں ہیں مگر دونوں طرف کے بزرگ، اور وہ نوجوان جو اب بڑھاپے کے دہلیز پر دستک دے رہے ہیں اس نسل کے مسلمان، سکھ اور ہندو افراد میں یہ خواہش شدید ہے کہ وہ ان جگہوں کو دوبارہ دیکھیں جہاں وہ پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے۔

وہ برسوں سے تقسیم کے بعد کی نسلوں کو سرحد پار کے ان قصبوں اور دیہاتوں کے بارے میں قصے کہانیاں سنائے جا رہے ہیں، جہاں سے انہیں بغیر کسی قصور کے زبردستی نکلنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس لئے نوعمر پنجابی بھی ان جگہوں کو دیکھنا چاہتے ہیں نہ صرف اپنے تجسس کی خاطر بلکہ اپنے ہی نسلی گروہ سے تعلق رکھنے والے سرحد کے اس پار آباد لوگوں سے رابطہ کرنے کے لئے۔ کاش انڈیا اور پاکستان کی حکومتیں اس پر توجہ دیں اور سرحد کے دونوں طرف اس قسم کے سفر کو آسان تر بنائیں۔ اس سلسلے میں ہمارے سامنے فرانس اور جرمنی کی مثال ہے جنہوں نے دنیا کے کسی بھی ملک کے مقابلے میں یورپ میں سب سے زیادہ جنگیں لڑیں اور تباہی مچائی مگر آج وہ دونوں یورپی برادری کے رکن ہیں اور ان کے شہری آزادی سے ایک دوسرے کے ملک میں جا سکتے ہیں اور کسی قسم کی کسٹم کی رکاوٹیں موجود نہیں ہیں۔

آیئے ہم بھی امید کریں اور دعا کریں کہ جلد ہی ہندوستان اور پاکستان بھی روایتی انداز میں سیاسی لحاظ سے نہیں بلکہ معاہدوں اور افہام و تفہیم کے تحت لوگوں اور سامان کی آزادانہ نقل و حرکت سے معاشی، معاشرتی اور ثقافتی لحاظ سے ایک دوسرے کے نزدیک آ جائیں گے۔

پران نیویل ______

پناہ گاہ یا دوزخ

آزادی کے بعد والٹن کیمپ ہزاروں تارکین وطن کی پناہ گاہ بن گیا جو اپنے خوابوں کی سرزمین پر آئے تھے۔ بدقسمتی سے یہی وہ جگہ تھی جہاں بہت سے لوگ بیماری اور حالات کی سختی کا شکار ہو گئے۔

سینکڑوں دوسرے نوجوان طلباء کی طرح ارشاد حمید خان نے بھی پاکستان بننے کے کچھ عرصے بعد والٹن کیمپ میں رضاکارانہ خدمات انجام دینے کا فیصلہ کیا۔ ارشاد، جو سردار عبدالحمید دستی کے بیٹے تھے، اپنے اس کام کو باعث فخر سمجھتے تھے۔ سردار صاحب بعد میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے تاہم ارشاد حمید خان نے اس کیمپ میں جو افتاد دیکھی وہ ان کی برداشت سے کہیں زیادہ تھی۔ ایک بار جب ارشاد کو مہاجروں کی بجائے پوری کی پوری ٹرین لاشوں سے بھری ملی تو وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے۔ آج انہیں سڑکوں پر بھیک مانگتے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کشکول کی بجائے ایش ٹرے ہوتی ہے۔ اگرچہ انہیں اپنے آبائی قصبے مظفر گڑھ میں خاصے احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے مگر ان کے سن رسیدہ چہرے اور پھٹی پھٹی آنکھوں میں آج بھی اس خوفناک منظر کی جھلک دکھائی دیتی ہے جس سے وہ پچاس برس پہلے گزرے تھے۔

لاہور کے نزدیک، والٹن کیمپ، نہ صرف ان لوگوں کے لئے جو وہاں ٹھہرے بلکہ پوری قوم کے لئے ایک ناقابل فراموش تجربہ تھا۔ ''والٹن ایک بہت بڑے سٹیج کی طرح تھا جہاں پر آفاقی سطح کے انسانی المیے پیش ہوتے تھے'' یہ ہیں الفاظ ایک بزرگ شہری پروفیسر ضیاء الدین کے جو اس کیمپ میں رضاکار کی خدمات سرانجام دیتے رہے تھے۔

والٹن پاکستان میں مہاجروں کے لئے سب سے بڑا کیمپ تھا اور ایک سال تک کام کرتا رہا۔ آزادی کے فوراً بعد ہی سرحد کے دونوں طرف کی آبادی کے ایک بڑے حصے کو ایک عجب پاگل پن نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پروفیسر ضیاء الدین کہتے ہیں " افریقہ اور بوسنیا میں قتل عام سے بچ جانے والوں کو قیام کی جگہ فراہم کرنے کے لئے جو مہاجر کیمپ قائم کیے جاتے ہیں ان کا والٹن کیمپ سے کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو آفت زدہ لوگوں کا ایک سیلاب تھا جو پناہ لینے کے لئے سرحد پار کر کے پاکستان چلا آ رہا تھا۔

تاہم کیمپ میں مہاجرین کو کوئی آرام وسکون حاصل نہیں ہوتا تھا کیونکہ مہاجرین کی تعداد بڑھتے بڑھتے پانچ لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ کیمپ ایک بڑا کھلا میدان تھا جس میں سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی، سوائے چند بیرکوں کے جن میں کچھ عورتوں اور سرکاری اہلکاروں کو جگہ دی گئی تھی اور اہم مہمانوں کو، جن میں قائداعظم بھی شامل تھے، ٹھہرایا گیا تھا۔

مرزا واجد علی جو اس کیمپ میں مہاجر کی حیثیت سے ٹھہرے تھے کہتے ہیں " والٹن میں کوئی سہولتیں نہیں تھیں لیکن پھر بھی جو کچھ اس نے ہمیں دیا ہمارے لئے بے حد اہمیت رکھتا تھا۔ ایک تو یہ اطمینان تھا کہ جھاڑیوں کے پیچھے کوئی دشمن حملہ کرنے کو چھپا نہیں بیٹھا تھا اور دوسرے کھانا مل جاتا تھا جو عموماً لاہور کے شہری ہمیں پہنچا دیتے تھے۔ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کئی کئی دنوں بلکہ ہفتوں کے فاقوں کے بعد کھانا ہمارے لیے کیا معنی رکھتا تھا۔"

اگر چہ والٹن پہنچنے والے لوگ مذہبی گروہوں کے بلوائیوں کے ہاتھوں مارے جانے کے خطرے سے بچ کر یہاں پہنچے تھے مگر یہاں بھی انہیں ایک خوفناک دشمن کا سامنا تھا اور وہ تھیں بیماریاں۔ بہت کم لوگوں کو یہ علم ہوگا کہ والٹن کا علاقہ مہاجروں کا سب سے بڑا قبرستان بھی ہے۔ بعض اوقات ایک ہی دن میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں افراد ان زخموں کی وجہ سے جو انہیں راستے میں لگے یا کیمپ میں موسم کی شدت کی وجہ سے یا صفائی کی بری صورتحال کی وجہ سے پھیلنے والی وباؤں کی وجہ سے مر جاتے تھے۔
"میں نے اپنے دو بچوں کو کیمپ میں دفنایا "ایک بزرگ مہاجر نے بتایا جو اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔" اور میں دس ماہ تک اپنی دو اغوا شدہ بہنوں کی تلاش میں کیمپ جاتا رہا۔ مجھے ان کی کوئی خبر نہ ملی حالانکہ اغوا شدہ عورتوں کی بازیابی کی تنظیم سینکڑوں عورتوں کو کیمپ میں لائی جن میں سے بہت سی عورتوں کو ان کے خاندان والوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔" انہوں نے بتایا کہ اغوا ہونے کے ڈر سے ان کے بہت سے رشتہ داروں نے اپنی عورتوں کو خود اپنے ہاتھوں ہلاک کر ڈالا تھا۔

ان تمام ہولناکیوں کے باوجود، بزرگ مہاجرین کے دلوں میں اس کیمپ کی اچھی یادیں بھی ہیں۔ آخر یہ ان کے لئے نئی سرزمین کا دروازہ تھا۔ غالباً یہ اسی قسم کے جذبات کا نتیجہ تھا کہ پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں نے، جو خود مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے مہاجر تھے، والٹن میں کیمپ کی جگہ پر ایک یادگار تعمیر کرنے کا سوچا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی یادگار ہوتی جو 175 ایکڑ کے علاقے پر تعمیر کی جاتی اور اس پر تقریباً سات کروڑ روپے لاگت آتی۔ اس عمارت کے اس قدر عظیم الشان ہونے کی وجہ سے اس منصوبے پر اس وقت خاصی تنقید کی گئی اور وائیں کے جانشینوں نے اس منصوبے کو سرد خانے میں ڈال دینے کا فیصلہ کیا۔ اس دوران لاہور میں منعقد ہونے والے ورلڈ کپ کرکٹ میچوں کے لئے پنجاب پولیس نے اس مقام پر کیمپ لگائے اور پھر اس مقام کو نہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب اس مقام پر لگے ہوئے بورڈ پر باب پاکستان کی بجائے عباس لائنز لکھا ہوا ہے۔ اس منصوبے کے لئے مختص کئے جانے والی زمین پر بھی جھگڑے شروع ہو گئے کیونکہ بوائے سکاؤٹس اور فوج کی طرف سے مخالفانہ دعوے کیے جا رہے تھے۔ تاہم اس منصوبے کا سیکرٹریٹ ایک چھوٹے سے کمرے میں آج بھی کام کر

رہا ہے۔اس منصوبے کے لئے مختص کی گئی رقم بھی ان کے اکاؤنٹ میں محفوظ ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس عرصے میں دوگنی ہوچکی ہے۔

پروفیسر ضیاء کہتے ہیں "یہ ان مرنے والوں کو اعزاز بخشنے کا وقت ہے جو والٹن میں دفن ہیں اور یہ وقت ہے کہ ان امیدوں کی ایک یادگار تعمیر کی جائے جو لوگوں نے پاکستان سے وابستہ کی تھیں، وہ امیدیں جو ان گنت دھوکوں کے بعد بھی مرنے کو تیار نہیں ہیں۔"

——— ضیغم خان

پاگل پن کے جواب میں پاگل پن

ڈاکٹر ایم ایس جیلانی جو حکومت پاکستان کے سیکریٹری رہ چکے ہیں اور ایک بین الاقوامی سول سرونٹ کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے ہیں اپنی یادوں کو کریدتے ہیں اور حیران ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے کیوں اپنے حصے کے پنجاب سے ایک دوسرے کو نکال باہر کیا۔

تقسیم سے پہلے کے پنجاب میں میٹرک کے امتحانات مارچ میں ہوا کرتے تھے اور نتائج کا اعلان جون میں کیا جاتا تھا۔ مارچ 1947 میں، میں اپنے والدین کے ساتھ ہوشیار پور میں تھا اور امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ میں ڈی اے وی (دیانند اینگلو ویدک) ہائی سکول کا طالب علم تھا جو اساتذہ اور طلباء دونوں کے حساب سے ایک ہندو سکول تھا اور اس میں بہت کم مسلمان یا سکھ زیر تعلیم تھے۔

سکول میں کوئی سیاست نہ تھی۔ مگر باہر یقیناً کوئی کھد بد ہو رہی تھی، یعنی آزادی اور پاکستان اور انڈیا میں تقسیم کی وجہ سے ملک کے مقدر کے بارے میں بے یقینی۔ ہوشیار پور ایک خوابیدہ ضلعی صدر مقام تھا جس کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ شوالیک کی پہاڑیوں اور پہاڑی قصبوں کانگڑہ، دھرم شالہ وغیرہ کے راستے میں آخری ریلوے سٹیشن تھا۔ یہ سکھ اور ہندو اکثریت والا ضلع تھا۔ جب کہ نزدیکی شہر جالندھر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور وہ ہوشیار پور کے مقابلے میں ایک بڑا شہر تھا اور ڈویژن کا صدر مقام تھا۔ مشرقی پنجاب میں خصوصاً امرتسر، گورداسپور، ہوشیار پور، جالندھر اور لدھیانہ کے اضلاع میں یا تو سکھوں کی اکثریت تھی یا وہ تعداد میں ہندو اور مسلمان آبادی کے برابر تھے۔ انہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ مسلمانوں کی حمایت کریں یا ہندوؤں کی۔ ہندو انہیں اپنی طرف کھینچتے تھے تاکہ مسلمانوں کو اقلیت ثابت

کر دیا جائے۔ مسلمان بھی ان کی حمایت حاصل کرنے کے خواہش مند تھے تاکہ مسلمانوں اور سکھوں کے مشترکہ ووٹوں سے وہ پاکستان میں مزید چند ایک اصلاح شامل کروالیں۔ مارچ 1947 میں ہونے والی گڑبڑ کے پیچھے یہی عوامل تھے، جن کو برطانیہ کے زیر تسلط انڈیا کی آئندہ شکل کے بارے میں قیاس آرائیوں نے مزید ہوا دی۔ بے یقینی کے اس مرحلے پر، ہر شخص کے جوش میں آجانے اور کسی گروہ کی طرف سے تشدد میں ملوث ہو جانے کا امکان موجود تھا۔ مغل بادشاہوں کے زمانے میں سکھوں نے سرکاری فوج کے ساتھ خونریز جنگیں لڑی تھیں جن کی وجہ سے سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان دشمنی کے آثار اب بھی باقی تھے۔ یہ بات 1947 کے آنے والے مہینوں میں فیصلہ کن ثابت ہوئی۔

جون 1947 انڈیا کی تاریخ میں اس لحاظ سے اہم مہینہ ہے کہ تقسیم کا وقت قریب آرہا تھا اور ریڈ کلف کمیشن اور ہندوستان کی برطانوی حکومت اہم فیصلے کر رہی تھی۔ چونکہ میں امتحانات سے فارغ ہو چکا تھا اس لئے میں نے ہوشیار پور سے اپنے آبائی قصبے جالندھر کا سفر بہت مرتبہ کیا۔ اگرچہ میری عمر صرف 15 برس تھی، مگر مجھے سکھ ڈرائیوروں کی بسوں میں تقریباً 25 میل کا سفر کرتے ہوئے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اس سفر میں تقریباً دو گھنٹے لگتے تھے کیونکہ ان دنوں جنگ کی وجہ سے بسیں میتھین گیس سے چلائی جارہی تھیں اور ان کی رفتار بے حد سست ہوتی تھی، نہ ہی کبھی کسی نے مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر جولائی تک معاملات خاصے بگڑ چکے تھے اور مسلمان خاندانوں نے محفوظ تر مقامات کی طرف نقل مکانی کرنی شروع کر دی تھی۔ میرے والد بھی اپنے تمام خاندان کو لے کر جالندھر میں میرے ننھیال کے گھر چلے آئے۔

میں حسب معمول ادھر ادھر گھومتا پھرتا، کیونکہ اس سے پہلے میں دو مرتبہ تھوڑے تھوڑے عرصے کے لئے جالندھر کے سکول میں زیر تعلیم رہ چکا تھا مگر شہر کے کچھ حصوں میں تناؤ کی سی کیفیت تھی۔ جسے بے چینی کہنا بہتر ہوگا۔ میری والدہ کا آبائی گھر پرانے شہر کے اندر واقع تھا۔ اس علاقے میں زیادہ تر سید اور سوری پٹھان مسلمان آباد تھے مگر ہمارے پڑوسی جو ایک پتلی سی گلی کے اس پار رہتے تھے اونچی ذات

کے ہندو تھے۔ یہ دونوں مذہبی گروہ گزشتہ چھ سو سال سے ایک دوسرے کے ساتھ بغیر کسی پریشانی کے رہ رہے تھے۔ دونوں گروہوں کے بچے ایک دوسرے کے بڑوں کو انکل، آنٹی یا زیادہ قریبی تعلقات میں چاچا، چاچی کہہ کر بلاتے تھے۔ ایک دوسرے کی دکانوں سے خریداری کرتے تھے، ایک دوسرے کے تہوار مناتے اور جنازوں میں شرکت کرتے۔ دوسرے لفظوں میں ایک دوسرے کی خوشی غمی میں شریک ہوتے تھے۔

پھر اچانک کچھ ہو گیا۔ ہمیں اپنے ہندو پڑوسیوں کی چھتوں پر سے مسلسل گولیاں چلنے کی آواز نے خطرے کا احساس دلایا۔ پٹھان لوگ پردے کا بہت خیال کیا کرتے تھے اور اسی لئے وہ ایک منزلہ مکان بناتے تھے۔ ہندوؤں کے مکانات اونچے ہوتے تھے اور دو منزلہ سے لیکر چار منزلہ تک ہوا کرتے تھے۔ اس طرح وہ مسلمانوں کو براہ راست نشانہ بنا سکتے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ کچھ گولیاں ہمارے مکان کو بھی لگی تھیں۔ میرے نانا جو محکمہ پولیس میں تھے اس وقت سنٹرل آرڈیننس ڈپو میں تعنیات تھے۔ میری والدہ ان کی اکلوتی اولاد تھیں اس لئے میرے والد ہی سارے گھر کی دیکھ بھال کے ذمہ دار

تھے۔ اگرچہ ان کے بہت سے ہندو اور سکھ دوست تھے، پھر بھی وہ پڑوسیوں کی طرف سے بلاوجہ فائرنگ پر سخت برہم تھے۔ اس کے نتیجے میں ہمارے بہت سے مسلمان پڑوسی ہمارے گھر میں پناہ لینے کے لئے آ گئے کیونکہ ہمارا مکان بڑا تھا اور مضبوط تھا۔ صورتِ حال پر غور کرنے کے لئے بڑوں کا جرگہ بلایا گیا اور پھر وہ ہر دفعہ فائرنگ کے بعد خوف و ہراس کی حالت میں اجلاس کرتے۔

اب میری سمجھ میں آتا ہے کہ وقفے وقفے سے فائرنگ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان یا تو بھاگ کر کہیں چلے جائیں یا پھر باہر نہ نکلیں۔ آنے والے دنوں میں ہم نے سنا کہ مسلمانوں کی دکانیں لوٹی جا رہی ہیں۔ شہر کے صنعتی علاقے میں جہاں مسلمان آباد تھے، مسلمانوں کے مارے جانے کی اطلاعات ملیں۔ سب سے قریبی تجربہ ہمیں اپنے والد کے ایک بزرگ دوست ڈاکٹر کے بارے میں ہوا۔ میرے والد اپنے دوست کے بارے میں پریشان تھے کیونکہ وہ ایک ایسے علاقے میں رہتے تھے جس کے بارے میں اطلاع تھی کہ اسے سکھوں نے لوٹ لیا ہے۔ جب میرے والد ان کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ گھر لوٹا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر اور ان کی بیوی گھر کے اندر مردہ پڑے تھے ان کے گلے کاٹ دیے گئے تھے اور ان کی دو بیٹیاں لاپتہ تھیں جن کا بعد میں کچھ پتہ نہ چل سکا۔ دوسرے شہروں سے آنے والے رشتہ داروں نے بھی مظالم کے ایسے واقعات سنائے جن سے گھر والے مزید خوفزدہ ہو گئے۔ ہمارے بڑے سیاسی حالات پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔ شہر بھر کی دکانیں بند تھیں سوائے ان کے جنہیں تالے توڑ کر لوٹ لیا گیا تھا، اس لئے گھر میں موجود لوگوں کے لئے کھانے پینے کا سامان دوسرے گھروں سے حاصل کیا جا رہا تھا جو ہندوؤں کے گھروں کی چھتوں پر بیٹھے نشانہ بازوں کی نظروں سے اوجھل تھے۔ اس پُر ہیجان زمانے میں میری والدہ نے 4 اگست کو میری سب سے چھوٹی بہن کو جنم دیا۔

اگست کے آغاز سے ہی ہمارے محلے میں خوفزدہ کرنے کے لئے مختلف حربے استعمال کیے جانے لگے۔ ہمارے گھر پر پولیس نے چھاپہ مارا کیونکہ انہیں بظاہر یہ اطلاع دی گئی تھی کہ اس گھر میں اسلحہ اکٹھا کیا جا رہا ہے۔ خوش قسمتی سے پولیس یہ جاننے پر واپس لوٹ گئی کہ یہ میرے نانا کا گھر ہے جو خود پولیس میں

تھے۔ رات کو پاکستان مخالف نعرے لگائے جاتے اور خوف و ہراس پھیلانے کے لئے چھتوں پر الاؤ جلائے جاتے۔

یہ سب کچھ ریڈ کلف ایوارڈ کے چکر میں کیا جا رہا تھا۔ جس میں پنجاب کی تقسیم کا فیصلہ کیا جانا تھا۔ ہر مذہبی گروہ کی کوشش تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ علاقہ اپنے قبضے میں کر لے۔ مسلمانوں کا خیال تھا کہ ضلع جالندھر کیونکہ مسلمان اکثریت والا علاقہ ہے اس لئے گورداسپور اور فیروز پور کی طرح اسے پاکستان میں شامل کیا جائے گا۔ ہندوؤں کا کہنا تھا کہ ایسا ان کی لاشوں پر سے گزر کر ہی ہو سکے گا۔ خوراک اور ایندھن کی کمی سے دباؤ مزید بڑھتا گیا اور اعصاب تباہ ہوتے گئے۔ ایوارڈ کے بارے میں افواہیں سننے میں آتی رہیں کہ کون کون سے اضلاع پاکستان میں شامل ہو رہے ہیں یا نہیں ہو رہے۔ اس سے محض پہلے سے پھیلی ہوئی افراتفری میں اضافہ ہوا۔

ریڈ کلف ایوارڈ کے اعلان کے بعد تو جیسے جہنم کا دروازہ ٹوٹ گیا۔ چھتوں پر سے مسلسل دن رات فائرنگ ہوتی رہتی اور ہم صحیح معنوں میں محاصرے میں تھے۔ میری ننھی سی بہن جو صرف پانچ دن کی تھی سارا دن فائرنگ کے شور کی وجہ سے روتی رہتی۔ میری والدہ، دوسری عورتیں، بوڑھے اور بچے ہر وقت کس نہ کسی چیز کی کمی کا سامنا کرنے پر مجبور تھے۔ آخر کار بزرگوں نے فیصلہ کیا کہ یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ اگلے روز، دن نکلنے سے پہلے ہمیں کہا گیا کہ دیوار پھلانگ کر دوسرے مسلمان گھروں کی طرف چلے جائیں جو ہندوؤں کے گھروں سے دور تھے۔ دو کتوں کو کافی خوراک اور پانی کے ساتھ وہیں چھوڑ دیا گیا۔

میرے والد نے اپنے سر پر ایک سیاہ ٹرنک اٹھایا ہوا تھا اور اپنی بندوق کو لاٹھی کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ میں نے انہیں اس سے پہلے کبھی اس حالت میں نہیں دیکھا تھا کہ انہوں نے سر پر ٹرنک اٹھایا ہو اور بنیان اور دھوتی پہن رکھی ہو۔

ہم جو اس وقت تک ایک چھوٹے سے قافلے کی شکل اختیار کر چکے تھے، تقریباً سو گز کے فاصلے پر ایک مکان میں جا کر ٹھہرے۔ یہ کچھ محفوظ تھا کیونکہ اس کے اردگرد سب مکان مسلمانوں کے تھے۔ یہاں سے جی ٹی روڈ تک پہنچنا بھی آسان تھا جو کنٹونمنٹ کو جاتی تھی، یہی ایک مقام تھا جسے جالندھر کے مسلمان اپنے لئے محفوظ خیال کر سکتے تھے۔

سب سے بڑا مسئلہ جس پر گھر میں اکٹھے ہونے والے مہاجروں میں مسلسل گفتگو ہو رہی تھی وہ یہ تھا کہ جالندھر سے کیسے باہر نکلا جائے۔ یہ وہ شہر تھا جس میں ان کے آباؤ اجداد شہنشاہ غیاث الدین بلبن کے زمانے سے یعنی تقریباً 680 برس سے آباد تھے۔ ان کا اپنا شہر اتنا پر خطر اور اجنبی کیوں ہو گیا؟ وہ کون لوگ تھے جو لوٹ مار کر رہے تھے، عورتوں کی بے حرمتی کر رہے تھے اور ایک مربوط معاشرے کا سکون برباد کر رہے تھے؟ تاہم سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ہم کہاں جائیں؟ دہلی جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کیونکہ وہاں بھی فسادات کی آگ بھڑک رہی تھی اور یہی حال باقی تمام بڑے شہروں کا تھا۔ پاکستان کی جانب جانے کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں سکھوں کے متبرک شہروں اور مضبوط ٹھکانوں، کرتار پور اور امرتسر سے گزرنا ہوگا جو خودکشی کے مترادف بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی لاہور نسبتاً نزدیک تھا۔ جالندھر میں کوئی ہوائی اڈا نہیں تھا اس لئے صرف دو ہی راستے تھے۔ سڑک یا ریل۔

ایک صبح دو تین فوجی ٹرک گلی میں آئے اور وہاں جمع سب لوگوں سے کہا کہ وہ اپنی ضروری چیزیں لے کر، جو وہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں، ٹرکوں میں سوار ہو جائیں۔ لوگوں نے بلاضرورت بھگدڑ مچائی کیونکہ فوجی ڈرائیور بالکل پر سکون تھے اور گلی میں کوئی بھی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ گھر کو تالا لگا دیا گیا حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ اسے فوراً ہی لوٹ لیا جائے گا، کیونکہ علاقے سے تمام مسلمان جا چکے تھے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ وہ اپنے گھر کو آخری بار دیکھ رہا ہے جو اس کے آباؤ اجداد نے برسوں پہلے بنایا تھا۔ بعض لوگوں کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس بات پر سکون یا شاید اللہ تعالیٰ کا شکر بھی تھا کہ اس نے ایسی طویل بے یقینی سے نجات دلائی۔

ٹرک شہر کے اندگلیوں میں آہستہ آہستہ چلنا شروع ہوئے۔ شہر کے سرکاری اور امیر رہائشی علاقوں سے ہوتے ہوئے جی ٹی روڈ تک پہنچ کر ان کی رفتار تیز ہو چکی تھی۔ تقریباً دو گھنٹے میں یہ چھوٹا سا قافلہ کنٹونمنٹ کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ لوگ ٹرکوں سے اترے اور بیرکوں میں اچھی جگہ پر قبضہ جمانے کے لئے ایک ریس شروع ہو گئی۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو مہاجر لوگ اپنے ساتھ پاکستان لائے اور جو برس ہابرس تک قائم رہے گی۔

یہ بڑی عجیب بات تھی کہ بھائی چارے اور اتحاد کا جو جذبہ محاصرے کے دوران دکھائی دیا تھا چند منٹوں میں ہوا ہو گیا۔ وہ ہر لحاظ سے اپنے ساتھیوں کے سکھوں اور ہندوؤں سے بھی زیادہ بڑھ کر دشمن ہو چکے تھے۔ ان کے درمیان پانی کے لئے، دودھ کے ایک گلاس کے لئے، ایندھن کی لکڑی کے لئے، چولہا بنانے کی اینٹوں کے لئے اور پھر ان غسلخانوں کے لئے جو فوجیوں نے کھلے میدان میں عارضی طور پر بنائے تھے، سخت کھینچا تانی ہوتی تھی۔

میرے والد پاکستان پہنچنے کے لئے کسی گاڑی وغیرہ کا بندوبست کرنے کے کوششیں کر رہے تھے۔ ذرائع مواصلات کی کمی کی وجہ سے یہ خاصہ مشکل کام تھا۔ مسلمانوں کے علاقوں میں مار دھاڑ کی خبریں اور تازہ مہاجرین مسلسل کیمپ میں پہنچ رہے تھے۔ انہوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ مسلمانوں کی آبادی کو کہیں بے قاعدہ انداز میں اور کہیں منظم طور پر ختم کیا جا رہا ہے۔ مجھے وہ مناظر یاد ہیں کہ نئے آنے والے مہاجرین اپنے گھر بار کھو جانے پر اور ان عزیز رشتہ داروں کے لئے رو پیٹ رہے ہوتے تھے

جنہیں فسادات میں مار ڈالا گیا، یا وہ گم ہوگئے، لاپتہ ہوگئے یا پھر اغوا کر لئے گئے۔ میرے والد کو ایک فوجی گاڑی میں شہر کے اندر اپنے گھر جانے کا موقعہ مل گیا۔ وہ ہمارے کتوں اور ایک بکس کے ساتھ واپس لوٹے جس میں کاغذات اور کپڑے تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ پورے محلے کے تمام مکانات خالی پڑے تھے سوائے ہمارے گھر کے۔ اس استثنٰی کی وجہ بتانے والا کوئی نہ تھا۔ سب سے قابلِ یقین وجہ کتے ہو سکتے تھے۔ کیونکہ وہ گھر میں اکیلے رہ گئے تھے اس لئے وہ یقیناً زور زور سے بھونک رہے ہوں گے اور اس وجہ سے لوٹنے والوں نے یہ سوچا ہوگا کہ گھر میں اب بھی کچھ لوگ موجود ہیں۔ میرے والد نے کتوں کو باہر نکالنے کے بعد گھر کا دروازہ لٹیروں کے لئے کھلا چھوڑ دیا۔ یہ آخری بار تھی کہ خاندان کے کسی فرد نے اس مکان کو دیکھا جس میں وہ کم از کم پچھلی بارہ پشتوں سے آباد تھے کچھ ہفتے بعد میرے والد نے اپنے ایک سکھ دوست، سردار بکرم سنگھ کو خط لکھا کہ وہ گھر کے اندر جائیں اور میرے دادا کو ان کی ملازمت کے دوران دیئے گئے سرٹیفکیٹ نکال لائیں۔ انہوں نے جواب میں لکھا کہ گھر لوٹ لیا گیا ہے اور صرف کتابیں بچی ہیں جو ہر طرف بکھری پڑی ہیں۔

آخر کار ایک دن خاصی ہل چل مچی کیونکہ خبر تھی کہ لاہور اومنی بس سروس کی کچھ بسیں لاہور سے مہاجروں کو لے جانے کے لئے آرہی ہیں۔ میرے والد کے بہنوئی لاہور اومنی بس کے ایک بڑے افسر تھے۔ میرا خیال تھا کہ انہوں نے ڈرائیوروں کو خاص ہدایت کی کہ وہ ہمیں تلاش کریں کیونکہ کچھ بسیں سیدھی کیمپ کے اس حصے کی طرف آئیں جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ کیمپ میں ٹھہرے ہوئے مہاجرین کی تعداد ڈھائی لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ بس میں جگہ کے لئے پھر ریس شروع ہوگئی۔ تمام بسیں کھچا کھچ بھر گئیں۔ کتے خود ہی چھلانگ مار کر بس میں چڑھ گئے اور اس سیٹ کے نیچے بیٹھ گئے جس پر میری والدہ بیٹھی تھیں۔ گھر میں بھی وہ ان کے بستر کے پاس یا اس کے نیچے بیٹھتے تھے۔ باہر کھڑے لوگوں نے بہت احتجاج کیا کہ کتوں کو کیوں لے جایا جا رہا ہے۔ مگر کوئی کچھ نہ کر سکا کیونکہ وہ اترتے ہی نہ تھے اور پھر بہر حال وہ سیٹ کے نیچے بیٹھے تھے سیٹ کے اوپر نہیں۔

بسیں چلنا شروع ہوئیں اور رفتہ رفتہ ایک فوجی قافلے کی صورت اختیار کر گئیں۔ جب یہ بسیں جی ٹی روڈ پر آ گئیں اور لاہور کی جانب جانے والی سڑک پر چلنے لگیں تو میں نے دیکھا کہ ایک فوجی جیپ قافلے کے آگے اور ایک پیچھے چل رہی تھی۔ ان پر چھ یا سات باوردی فوجی سوار تھے۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ یہ جیپیں آگے سے پیچھے اور پیچھے سے آگے کی طرف چکر لگا رہی ہیں۔ وہ مشہور مقامات جہاں گھاتیں لگائی جاتی تھیں سکھ آبادی والے شہر کرتار پورہ کے نزدیک ایک پل تھا، دریائے بیاس کے دائیں کنارے پر واقع شہر بیاس تھا اور امرتسر کا شہر تھا۔ ان مقامات سے گزرتے ہوئے فوجی بے حد چوکس ہو جاتے تھے۔ بسوں کی رفتار بڑھا دی جاتی تھی اور حفاظتی پہرہ بھی تیز ہو جاتا۔ مجھے اٹاری یا واہگہ کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں سوائے اس کے کہ وہاں کچھ وردی والے لوگ تھے۔ 31 اگست کو غروب آفتاب کے بہت دیر بعد ہم والٹن کیمپ پہنچے۔

وہاں ہمارے اومنی بس والے انکل گاڑی لئے ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے ہمارے خاندان اور ہمارے دونوں کتوں کو ساتھ لیا اور ہمیں شہر لے گئے۔ والٹن میں موجود انسانوں کا سمندر اس بات کا ثبوت تھا کہ لاکھوں دوسرے لوگوں کے طرح میرے اور میرے گھر والوں کے لئے بھی زندگی کا ایک باب بند ہو چکا تھا۔ میرے نانا جو دہلی میں تھے ان کی ہمیں کوئی اطلاع نہ تھی۔

یہاں پر ہم کسی حد تک آرام سے رہنے کی کوششوں میں لگ گئے جبکہ میرے والد اپنے دفتری کاموں، اپنی نئی تقرری، روپیہ، گاڑی وغیرہ کے سلسلے میں مصروف ہو گئے۔ سب سے پہلی چیز مکان تھا۔ ایک شام میرے والد، میری والدہ، نانی اور مجھے، جو خاندان کے بچوں میں سب سے بڑا تھا، ساتھ لے کر نہر کے کنارے ایف سی کالج کے پاس ایک مکان دکھانے کے لئے گئے۔ یہ ایک بہت بڑا مکان تھا اور اس میں خوبصورت لان بھی تھا۔ میری والدہ نے یہ کہہ کر وہ مکان لینے سے انکار کر دیا کہ ہم اس کا خرچہ نہیں اٹھا سکتے۔ میرے والد نے بھی اس بات سے اتفاق کیا۔ ہم نے اس مکان کو لینے کا خیال ترک کر دیا حالانکہ اس مکان کا چوکیدار التجائیں کرتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی خاندان اس گھر میں رہنا شروع کر دے کیونکہ ہر شام مسلح لوگ آ کر اس گھر کو لوٹنا شروع کر دیتے ہیں۔

چند دن بعد، میرے والد نے بتایا کہ وہ لاہور سے کوئی 42 میل کے فاصلے پر واقع شہر گوجرانوالہ گئے تھے اور وہاں انہیں ان کے ایک پرانے دوست اور ہم جماعت چوہدری طفیل احمد، جو فیض احمد فیض کے بھائی تھے، کی مدد سے ایک متروکہ مکان الاٹ ہو گیا ہے۔ اس طرح ایک بس یا ٹرک کرائے پر لیا گیا اور ہم لاہور سے سول لائنز گوجرانوالہ میں واقع اس مکان میں چلے آئے جس کی ہر چیز لوٹی جا چکی تھی سوائے بھاری سامان کے۔ پانی کیلئے لگا ہوا ہینڈ پمپ باقی رہ گیا تھا اور شکر ہے کہ بجلی کی تاریں بھی اپنی جگہ موجود تھیں۔ کچھ ہی دنوں میں میرے والد نے کچھ دوستوں اور کچھ رشتہ داروں کو تلاش کر لیا اور گھر کی کچھ صورت نکلتی دکھائی دینے لگی۔

ایک روز صبح میرے نانا، بالکل اچانک۔ اپنے پرانے نوکر کے ساتھ ہمارے گھر پہنچ گئے۔ ہم سب نے میری سرکردگی میں ان کی آمد کی جہاں تک ممکن تھا خوب خوشی منائی۔ وہ فوجی ٹرکوں کے ذریعے دہلی چھاؤنی سے بچ کر نکلے۔ انہوں نے کس طرح گوجرانوالہ میں ہمارے گھر کا پتہ لگایا، اس میں یقیناً ان کی پولیس کے محکمے میں طویل ملازمت اور دہلی اور شملہ میں ان کے رابطوں کا دخل ہوگا۔ میرے والد کی تقرری چونیاں میں ہوئی، یہ ایسی جگہ تھی جس کا نام ہمارے خاندان میں کسی نے بھی سن نہ رکھا تھا۔ میرے والد نے یہ تقرری نیم دلی سے عارضی انتظام سمجھ کر قبول کر لی۔ اس لئے میرے نانا نے گھر کا انتظام سنبھال لیا اور باقی رشتہ داروں کی تلاش شروع کی۔ جالندھر سے آنے والوں میں سے زیادہ تر لوگ فیصل آباد اور منٹگمری چلے گئے تھے لیکن ہماری طرح کے کچھ لوگ بھی تھے جو دوسرے مقامات کی طرف چلے گئے۔ میرے دادا تعلیم کے معاملے میں بڑے سخت تھے۔ اب ستمبر ختم ہو رہا تھا یا اوائل اکتوبر تھا اس لئے ہم سب کو سکولوں اور کالجوں میں داخل ہو جانا چاہیے تھا۔

میرے بہن بھائیوں کو اس سکول میں داخل کرا دیا گیا جو اس ساری اتھل پتھل میں باقی بچ گیا تھا۔ کچھ مسلمان اساتذہ نے صوفی جمال اللہ کی سربراہی میں اسلامیہ کالج قائم کیا اور میں اس کالج کا پہلا طالب علم تھا۔ میرا رول نمبر 1 تھا۔ میرے نانا کو بڑی مایوسی ہو رہی تھی کیونکہ وہ دہلی کے سینٹ سٹیفنز

کالج میں میرے داخلے کے انتظامات کر چکے تھے۔ مگر میں نے انہیں بتایا کہ حکیم محمد حسین ایک بہترین پرنسپل ہیں اور انہیں صوفی صاحب کے بارے میں بتایا۔ کچھ ہی دنوں میں میرے نانا کہ پرانے دوست، سینٹ سٹیفنز کالج کے ڈاکٹر اظہر علی بھی یہاں آ گئے۔ اس سے انہیں کچھ اطمینان ہوا۔ میں کالج میں مصروف ہو گیا۔ شام کے وقت میں مہاجر کیمپوں میں جایا کرتا تا کہ وہاں موجود ناکافی عملے کی مدد کر سکوں۔ میں راشن کارڈ بنانے میں عملے کی مدد کرتا، مہاجروں کے خط لکھتا جنہیں اپنے گمشدہ رشتہ داروں کی تلاش، ملازمت، بچوں کی تعلیم، صحت، صفائی جیسے بے شمار مسائل کا سامنا تھا۔

اب میرے پاس وقت تھا کہ سوچوں اور یاد کروں۔ گزشتہ چھ ماہ میں یعنی مارچ سے لے کر اگست 1947 تک جو کچھ پیش آیا وہ ایک معمے کی طرح تھا جس کے ٹکرے اپنے اصل رنگوں میں سامنے آتے جا رہے تھے۔ یہ واقعات کا ایسا جنجال نہیں تھا جس کی وجوہات سمجھ میں نہ آ سکیں۔ میرے ذہن میں جو سوالات تھے وہ درج ذیل ہیں۔

- ایک سیاسی فیصلہ کیا گیا تھا کہ جب برطانوی حکمران یہاں سے جائیں گے تو دو ممالک قائم کئے جائیں گے۔ مگر کسی کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ پاکستان میں صرف مسلمان ہوں گے اور ہندوستان میں صرف ہندو رہیں گے۔ اگر ایسی کوئی چال نہیں تھی تو پھر مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کا قتل عام کیوں کیا گیا؟ اس کے بدلے میں ہندوؤں کو انڈیا کے طرف دھکیل دیا گیا۔

- سکھوں کو ہندوؤں کے مساوی کیوں قرار دیا گیا جبکہ ان کی روایات اور عقائد مسلمان صوفیوں کے زیادہ نزدیک تھے؟ ان کے عقیدے کو کس نے تبدیل کیا؟

- مشرقی پنجاب میں ہونے والے قتل عام زیادہ تر سکھوں کے علاقوں میں ہوئے۔ یہاں تک کہ ایسے علاقوں میں جہاں سکھوں کی اکثریت نہیں تھی وہاں بھی مسلمانوں کے قتل عام میں سکھ آگے آگے تھے۔ کیا ہندوؤں نے انہیں اس کام پر اجرتا رگایا تھا یا پھر ان کی حوصلہ افزائی کی جا رہی تھی کہ وہ مسلمانوں کو نکال باہر کریں گے اور ان کا مال و دولت لوٹ کر اپنے پاس رکھ لیں۔

- ہندوؤں نے مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کی کوشش کیوں کی؟ کیا یہ عدم تحفظ کے احساس کی وجہ سے تھا کیونکہ عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہوتے ہیں یا پھر یہ مسلمانوں کی سات صدیوں کی حکمرانی اور پاکستان، وہ ملک جہاں مسلمان اپنے مذہب پر عمل کر سکیں گے، کے قیام کے لئے مسلمانوں کی کامیاب حکمت عملی کے خلاف انتقام تھا؟

- انتہا پسند مذہبی جماعتوں کا دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے خلاف نفرتیں بھڑکانے میں کیا کردار تھا؟ کیا اس کا مقصد ان کی حمایت حاصل کرنا تھا یا دوسرے مذاہب کے لوگوں کو ختم کرنا تھا؟ بہر صورت انتہا پسندوں کے اکا دکا واقعات میں ملوث ہونے کے اطلاعات تو موجود ہیں تاہم مشرقی پنجاب میں زیادہ منظم سرگرمیاں ایک نیم انتہا پسند جماعت کی طرف سے کی گئیں۔ سکھوں میں ہمیشہ سے عسکریت کا رجحان موجود تھا مگر منظم عسکریت پسندی صرف چند ایک شہروں اور دیہی علاقوں میں دیکھنے میں آئی، شاید یہ محض بے قابو دنگا فساد تھا۔

ان سوالوں کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ اس سلسلے میں اب تک کی جانے والی کوششیں کچھ اطمینان بخش نہیں ہیں اور میں اس میں محققوں اور مصنفوں کو قصوروار نہیں سمجھتا۔ سب سے نمایاں وجہ صرف دولت کی خواہش اور لالچ نظر آتی ہے اور یہ سرحدوں کے دونوں طرف نمایاں تھی۔ 1947 کے فسادات زیادہ تر پنجاب میں ہوئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پنجاب کی تقسیم وہ عنصر تھی جس کی وجہ سے

قتل و غارت شروع ہوا۔ با اثر ہندو تاجر اور افسر شاہی اور بعض مسلمان سیاستدان پنجاب کی تقسیم اور لاہور شہر اور سکھوں کے بہت سے مقدس مقامات پاکستان کو دیئے جانے پر بہت ناخوش تھے۔ غالباً ان کی کوشش یہ تھی کہ فسادات کے ذریعے ریڈ کلف ایوارڈ کمیشن پر دباؤ ڈال کر تقسیم کو منسوخ کرایا جائے۔ کسی حد تک وہ کامیاب بھی ہوئے اور حد بندی میں ردو بدل کرالیا۔ تقسیم کو روکنے میں ناکامی پر ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں نے اپنے اپنے علاقوں میں اپنے مخالفین پر غصہ اتارا۔ جب ایک عمومی افراتفری مچ گئی اور کچھ بدمعاشوں نے پیسے بھی بنا لیے تو اسے راتوں رات امیر اور بارسوخ بن جانے کے لئے اللہ کا دیا ہوا ایک سنہری موقع سمجھا جانے لگا۔

اس کے علاوہ یہ ایک مذہبی فریضہ سمجھا گیا کہ ہر مذہبی گروہ کیطرف سے کئے گئے مظالم کی داستانوں کو اکٹھا کیا جائے۔ شاید یہ ضرورت سے زیادہ سادہ بیانی دکھائی دے مگر تقسیم کے برسوں بعد تک پائے جانے والے حالات اس نکتہ ءنظر کو درست ثابت کرتے ہیں۔ راتوں رات امیر بننے کا سلسلہ جو مجبوراً نقل مکانی کرنے والوں کے چھوڑے ہوئے عالیشان مکانات، کاروبار، باغات، زرعی اراضی پر قبضے سے شروع ہوا بعد میں اپنے ہی ہم مذہب کمزور مقامی لوگوں کی املاک پر قبضے کی صورت میں جاری رہا۔ یہ سلسلہ نصف صدی گزر جانے کے بعد آج بھی جاری ہے بلکہ پہلے سے زیادہ بڑھتا جا رہا ہے۔ دونوں طرف کے وہ لوگ جنھوں نے قتل و غارت کا سامنا کیا شاید اسے بھلا تو نہ پائیں مگر اسے معاف کرنے کو ضرور تیار ہوں گے۔ اگر کوئی ان سے معذرت کرے اور یہ کہے کہ جو کچھ ہوا اس میں یہاں کی وسیع تر آبادی کا ارادہ شامل نہیں تھا۔

——— ڈاکٹر ایم ایس جیلانی

زخم آج بھی ہرے ہیں

ضیاء الحق، حکومت ہند کے ایک سابق افسر، 1947 میں انڈیا کے دارلحکومت سے بے شمار مسلمانوں کی لاہور آمد کا منظر یاد کرتے ہیں۔

میں نے قیام پاکستان کا اعلان اس وقت سنا جب انبالہ چھاؤنی میں سگریٹ کا پیکٹ خریدنے نکلا تھا۔ میں فوراً دہلی پہنچا جہاں میں امپیریل سیکرٹریٹ کے ملٹری فنانس ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتا تھا۔ میرا دفتر ساؤتھ بلاک میں واقع تھا جہاں جی ایچ کیو اور محکمہ دفاع کے دوسرے دفاتر بھی تھے۔

چوہدری محمد علی، جو بعد میں پاکستان کے وزیراعظم بھی بنے اور اس وقت ایڈیشنل فنانشل ایڈوائزر کے عہدے پر فائز تھے، انگریز حکومت نے پاکستان کی ملٹری فنانس کا فنانشل ایڈوائزر مقرر کر دیا۔

تقسیم ہندوستان کا فیصلہ کرنے کے بعد برطانوی حکومت نے تمام محکموں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پاکستان اور ہندوستان۔

ابھی ریڈ کلف ایوارڈ کا اعلان نہیں ہوا تھا اور خط تقسیم ابھی نہیں کھینچے گئے تھے۔ بہت سے ہندوؤں کا خیال تھا کہ ان کے آبائی شہر ہندوستان کے علاقے میں شامل کیے جائیں گے۔ اسی طرح بہت سے مسلمانوں کا خیال تھا کہ ان کے گاؤں اور شہر پاکستان کے حصے میں آئیں گے۔ پاکستان کو حکومت کا کاروبار چلانے کے لئے اہم ریکارڈ کی ضرورت تھی۔ ہم سب، کیا عملہ اور کیا افسران، ہاتھ سے ریکارڈ کی کاپیاں تیار کرنے میں لگ گئے کیونکہ فوٹو کاپی کی مشینیں تو اس وقت ایجاد ہی نہیں ہوئی تھیں۔

اگرچہ کشیدگی بڑھ رہی تھی مگر دہلی میں کوئی فسادات ابھی تک نہیں ہوئے تھے۔ 4 ستمبر کو شام سات بجے سے لے کر صبح چھ بجے تک کا کرفیو لگا دیا گیا تھا۔ دفاتر کا وہ تمام عملہ جو دیر تک کام کر رہا تھا اسے خصوصی پاس مہیا کیے گئے تا کہ کسی قسم کا سانحہ پیش نہ آئے۔ اسی روز میں اپنے دفتر سے گھر کے لئے تقریباً آدھی رات کو نکلا۔ یہاں یہ بتا تا چلوں کہ ہندوستانی عملہ بھی نقول تیار کرنے میں ہماری مدد کے لئے دیر تک کام کر رہا تھا۔ ایک سٹاف کار مجھے دہلی کلاتھ ملز کے نزدیک ریلوے کالونی میں اس گھر تک پہنچانے کے لئے جا رہی تھی، جہاں میں اپنے ایک دوست، کفایت اللہ کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ میرے دوست بمبئے بڑودہ سنٹرل انڈین ریلویز میں پرمنینٹ وے انسپکٹر تھے۔ اس رات سٹاف کار میں ہم تین افراد سوار تھے۔ جب میں کار میں تہبارہ گیا تو ڈرائیور نے اطلاع دی کہ کار میں پٹرول ختم ہو گیا ہے اور وہ مجھے میری رہائش گاہ تک نہیں پہنچا سکتا۔ اس نے مجھے اجمیری دروازے کے باہر اینگلو عربیک کالج کے گیٹ پر (جہاں 1946 میں مسلم لیگ کا تاریخی کنونشن منعقد ہوا تھا) اتار دیا۔ اس وقت رات کا ایک بجا تھا اور مجھے اپنے گھر تک پہنچنے کے لئے کم از کم چار میل کا فاصلہ پیدل طے کرنا تھا۔ گارسٹن برٹن روڈ سے گزرنے کے بعد میں قطب روڈ تک پہنچا۔ ایک کار میرے قریب سے گزرتے ہوئے رکی اور اس کے ڈرائیور نے جو سویلین لباس میں تھا اور اس کے ساتھ ایک سکھ پولیس انسپکٹر کے وردی میں بیٹھا تھا، مجھ سے سوال جواب شروع کیے کہ میں کون ہوں اور رات کے اس وقت یہاں کیا کر رہا ہوں۔ میری وضاحت پر انہوں نے مجھے کار میں بیٹھ جانے کو کہا مگر میں نے انکار کر دیا کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ شاید کوئی دھوکہ ہو۔ میری ہچکچاہٹ کو محسوس کرتے ہوئے کار کے ڈرائیور نے مجھ سے کہا کہ ڈرو مت، میں

رندھاوہ ہوں، دہلی کا ڈپٹی کمشنر۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور فوراً اسے پہچان لیا کیونکہ ان کی تصویریں اکثر اخبارات میں چھپتی تھیں۔ وہ ایک انصاف پسند اور سخت افسر کے طور پر اور مسلمانوں کی جانب ہمدردانہ رویے کے لئے مشہور تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ مجھے کہاں جانا ہے تو اس نے بتایا کہ اسی شام اس علاقے میں چھرا گھونپنے کے دو واقعات ہوئے ہیں، جس میں سے مجھے گزر کر جانا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مجھے گاڑی میں بیٹھنے کیلئے کہا۔ یہ دہلی میں فسادات کا پہلا اشارہ تھا کیونکہ اس سے پہلے کشیدگی پائی جاتی تھی مگر کوئی سانحہ رونما نہیں ہوا تھا۔

مسٹر رندھاوا نے مجھے ریلوے کالونی میں چھوڑا۔ گارڈ نے (جو نیپالی گورکھا تھا) دروازہ کھولا اور مجھے بتایا کہ میرے دوست کو تقریباً یقین ہو چلا تھا کہ میں مارا جا چکا ہوں کیونکہ انہیں چھرا گھونپنے کے واقعات کی اطلاع مل چکی تھی اور ان کا خیال تھا کہ میں شاید کسی بڑے خطرناک رستے سے آ رہا ہوں۔

کفایت نے اور میں نے وہ رات بڑی شدید بے چینی میں گزاری۔ صبح تقریباً آٹھ بجے میں صحن میں نکلا تو مجھے محسوس ہوا کہ کوئی مجھے دہلی کلاتھ ملز کے چھت سے دیکھ رہا ہے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک ہجوم گیٹ پر موجود تھا اور مطالبہ کر رہا تھا کہ ہم دونوں کو ان کے حوالے کر دیا جائے کیونکہ اس کالونی میں ہم دونوں ہی مسلمان تھے۔ ٹھاکر گنگا سنگھ، جو رہتک کے جاٹ تھے، ہمارے بالکل ساتھ والے مکان میں رہتے تھے اور بی بی سی آئی ریلویز کے آفیسر سپرنٹنڈنٹ تھے۔ انہوں نے ہم سے کہا کہ تم لوگ میرے گھر چلے جاؤ۔ ہم ان کے پیچھے ہو لئے اور انہوں نے ہمیں ایک کمرے میں چھپا دیا جہاں خاندان کی عورتیں موجود تھیں۔ کالونی کا گیٹ کھول دیا گیا اور بلوائیوں نے ہمارے گھر کی تلاشی لی، مگر انہیں چوری اور لوٹ مار کی اجازت نہیں دی گئی کیونکہ ٹھاکر اور دوسرے لوگوں نے کہا کہ جو چیزیں یہاں رہ گئی ہیں اب وہ ان کی ملکیت ہیں۔ ہجوم نے ضد کی کہ ہم دونوں اسی علاقے میں کہیں چھپے ہوئے ہیں۔ وہ ہماری جان کے پیچھے تھے۔ ٹھاکر نے انہیں اپنے گھر میں جھانکنے کی اجازت دے دی مگر وہ کمرے میں داخل ہونے کی جرات نہ کر سکے کیونکہ وہاں ٹھاکر کی تین بیٹیاں بیٹھی تھیں۔ جب

ہجوم واپس چلا گیا تو ہمیں ناشتہ کرایا گیا اور اس کے بعد ہمیں بتایا گیا کہ ٹھاکر اب مزید ہماری حفاظت نہیں کر سکے گا۔ میں نے خاکی پینٹ، سفید قمیض اور پگڑی پہنی اور ہاتھ میں چھڑی لی۔ یہ پنجاب پولیس کے افسران کا ڈیوٹی کے بعد کا یونیفارم تھا۔ دہلی پولیس کو بھی پنجاب پولیس ہی مانا جاتا تھا۔ میں نے کفایت سے کہا کہ ایک بیگ میں جو ڈاکٹروں کے بیگ کی طرح کا تھا، دو جوڑے کپڑے رکھ لو۔ اس نے ہاتھ میں سٹیتھوسکوپ بھی پکڑ لیا جو اس کا ایک ڈاکٹر دوست اس کے ہاں چھوڑ گیا تھا۔ اب میں ایک پولیس افسر دکھائی دے رہا تھا اور کفایت ایک ڈاکٹر۔ کفایت چونکہ ریلوے افسر تھا اس لئے اس نے کہا کہ ہمیں ریلوے کے شنٹنگ شیڈ کی طرف جانا چاہیے، شاید ہمیں کوئی ریلوے انجن مل جائے جو ہمیں دہلی ریلوے سٹیشن تک لے جائے۔ وہاں سے ہم کسی محفوظ جگہ مثلاً جامعہ مسجد پہنچنا چاہتے تھے جو مسلمانوں کا گنجان آباد علاقہ تھا۔ ہم شنٹنگ شیڈ تک گئے وہاں ایک انجن موجود تھا مگر ڈرائیور کو چھرا گھونپ کر مار دیا گیا تھا اور اس کی لاش پاس ہی زمین پر پڑی تھی۔

اب صرف یہی راستہ تھا کہ ہم سرکلر روڈ پار کر کے باڑا ہندو راؤ سے گزر کر، جہاں گزشتہ رات دو افراد کو چھرا گھونپ کر مارنے کا واقعہ ہو چکا تھا، صدر بازار چلے جائیں۔ یہاں پر سخت انتہا پسند ہندوؤں کی کثیر
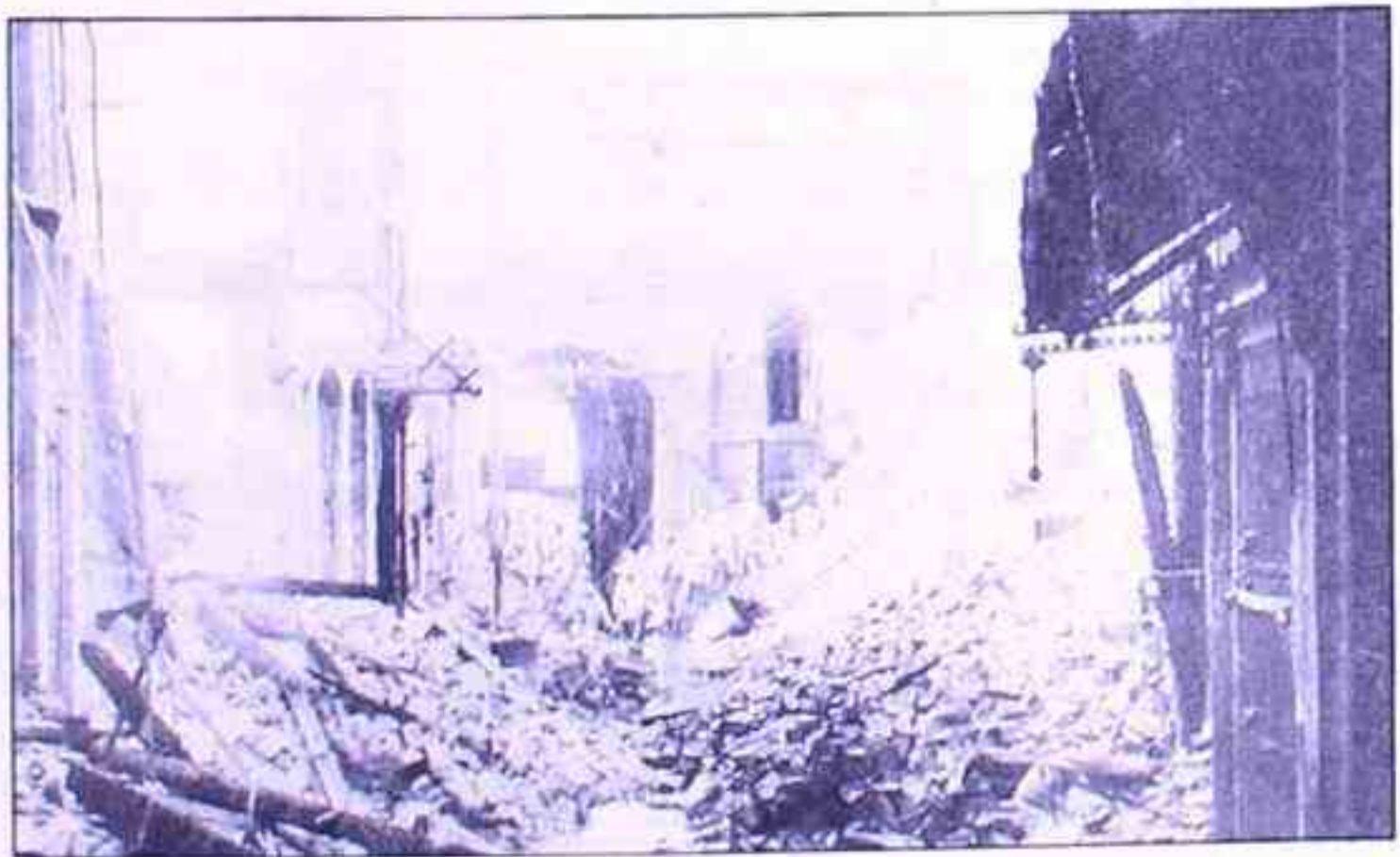
تعداد آباد تھی جنہیں جن سنگھ کہا جاتا تھا۔ ہم دونوں نے سرکلر روڈ پار کی اور خطرناک علاقے سے گزرے۔ ڈیوٹی پر موجود پولیس اور ہمارے آس پاس کے لوگوں کے رویے سے یہ پتا چلا کہ ہماری سکیم کامیاب رہی۔ ہم صدر بازار اور قطب روڈ کے چوک پر پہنچ گئے۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں بڑی تعداد میں مسلمان رہتے تھے۔ موڑ کے نزدیک ہی ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا جس میں ہم نے کمرہ لے لیا اور جلد ہی ہمیں پتہ چلا کہ ہم تنہا نہیں ہیں۔ بہت سے دوسرے مسلمان بھی یہاں آ رہے تھے جن میں زیادہ اکثریت پنجابی سرکاری ملازمین کی تھی، جو اپنی ملازمتوں کے سلسلے میں دہلی میں تھے۔ کمروں کی ڈیمانڈ بہت زیادہ تھی چنانچہ ہمیں دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر رہنا پڑا اور جلد ہی ہم ایک خاندان کی طرح گھل مل گئے۔

ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے لوگوں میں ایک شخص سرفراز تھا جو گوجر خان کا رہنے والا ایک خاکسار لیڈر تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ پولیس اس کی تلاش میں ہے۔ چنانچہ اس کی موجودگی ہم سب کے لئے مزید خوف اور پریشانی کا باعث تھی۔ میں نے پیشکش کی کہ میں اس کے ساتھ ایک کمرے میں رہنے کو تیار ہوں۔ اس کے ذرا دیر بعد مجھے ہوٹل انتظامیہ والوں نے بلایا اور بتایا کہ ایک پولیس افسر مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ پنڈت جگن ناتھ، مجھے بہت اچھی طرح جانتے تھے کیونکہ وہ فیروز پور میں میرے دو کزنز کے ساتھ کام کرتے تھے۔ انہوں نے بڑی رازداری سے مجھے کہا کہ میں صبح دس بجے سے پہلے پہلے اس ہوٹل سے چلا جاؤں۔ میں نے کئی علاقوں کا ذکر کیا جہاں میں جا سکتا تھا۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ ان مقامات سے دور چلا جاؤں۔ وہ رحمدل انسان تھے اور میں ان کے چہرے پر دکھ کے آثار دیکھ رہا تھا۔ اس بات کا با آسانی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اگلے دن کے لئے کچھ ٹارگٹ طے کئے جا چکے تھے۔ اب منظم قسم کا قتل و غارت شروع ہو چکا تھا۔ میں خاص طور پر ایک علاقے پہاڑ گنج کے بارے میں پریشان تھا جہاں میرے کئی دوست اور دفتر کے ساتھی رہتے تھے۔

شہر میں سخت کرفیو لگا ہوا تھا اور "دیکھتے ہی گولی مار دینے" کے احکامات دیے جا چکے تھے۔ میں نے ایک خطرناک مگر بے تابانہ فیصلہ کیا۔ میں آدھی رات کو اپنے ہوٹل کے کمرے سے نکلا اور تنگ و تاریک

گلیوں سے گزر کر پہاڑ گنج پہنچا۔ میں اپنے دوست ایس ایم ریاض کے گھر پہنچ گیا جو بعد میں سی ڈی اے اسلام آباد کے پہلے فنانس افسر بنے۔ ہم چھ ستمبر کو علی الصبح ایک دوسرے سے ملے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ دوستوں میں سے کوئی بھی اپنا گھر اس وقت تک خالی نہیں چھوڑے گا جب تک میں کرائے کی ٹیکسیاں نہ لے آؤں جس میں ہم کسی منزل کیطرف جائیں گے جس کا مجھے خود بھی علم نہ تھا۔ فیصلہ یہ تھا کہ اس علاقے کو چھوڑ دیا جائے اور کہیں اور جایا جائے۔ میں صبح چار بجے واپس ہوٹل پہنچا۔

کرفیو صبح سات بجے اٹھالیا گیا اور ساڑھے سات بجے صبح دوبارہ نافذ کر دیا گیا۔ کفایت اللہ، سرفراز، ملٹری اکاؤنٹس کے ایک افسر حاجی بشیر اور میں نے ہر صورت میں یہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مذکور بالا پولیس افسر کی دی ہوئی اطلاع کے روشنی میں ہمیں یقین تھا کہ یہ ہوٹل قیام کے لئے غیر محفوظ ہے۔ سات بجے صبح میں دہلی ریلوے سٹیشن جا کر ٹیکسیاں لانے کی کوشش میں ناکام واپس آ چکا تھا۔ تاہم میں نے ہوٹل کے بالکل سامنے والی گلی میں ایک ٹانگہ سٹینڈ پر کچھ ٹانگے کھڑے دیکھے تھے۔ ہم چاروں نے تیزی سے سڑک پار کی اور اس جگہ آ گئے جہاں ٹانگے کھڑے تھے، مگر دیکھا گیا کہ ٹانگہ بان پاس ہے مردہ پڑا ہے۔ میں ٹانگے میں بیٹھ گیا اور اپنے ساتھیوں کو سواریوں کے طور پر بٹھا کر اسے کناٹ پیلس لے گیا۔ میں نے پولیس سے بچنے کے لئے اب بھی پگڑی پہن رکھی تھی۔ ہمیں کوئی ٹیکسی نہ مل سکی کیونکہ کوئی بھی ٹیکسی ڈرائیور اتنے کم پیسوں میں چلنے کے لئے تیار نہ تھا جو ہمارے پاس اس وقت موجود تھے۔

جب ہم امپیریل سیکرٹریٹ کے پاس پہنچے تو مجھے اندازہ تھا کہ گھوڑا اس چڑھائی پر نہیں چڑھ سکے گا چنانچہ ہم نے ٹانگہ وہیں چھوڑ دیا اور پیدل چل پڑے۔ جب ہم گیٹ پر پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ ہمیں ساؤتھ بلاک کے پچھلی طرف جانا چاہیے جہاں C-2 ہٹمنٹ میں ایک عارضی کیمپ قائم کیا گیا ہے۔ یہ بیرکیں عالمی جنگ کے دوران اضافی سرکاری دفاتر کے لئے اور امریکی فوجیوں کے لئے بنائی گئی تھیں۔ جب ہم C-2 پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ تقریباً ایک سو خاندان وہاں پہلے ہی موجود ہیں۔ میں بے

حد پریشان تھا اور مستقل پہاڑ گنج میں رہ جانے والے اپنے دوستوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کیونکہ میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ اس وقت تک وہاں سے نہ نکلیں جب تک میں ٹیکسی لے کر ان کے پاس نہ پہنچوں۔ میرے دماغ میں جیسے فلم چل رہی تھی۔ میں اپنے دوستوں کی نوجوان بیویوں اور ان کی بہنوں کو اغوا ہوتے اور ان کی عصمت دری ہوتے ہوئے تصور کر سکتا تھا۔ یہ سوچ رہا تھا کہ وہ سب کے سب کہیں مردہ پڑے ہوں گے۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں اس کا ذمہ دار ہوں کیونکہ اگر میں نے انہیں مدد کا یقین نہ دلایا ہوتا تو وہ خود سے کہیں اور چلے گئے ہوتے۔ میرا بہت برا حال تھا۔ میں ایک کونے میں چلا گیا اور زمین پر گر کر اللہ تعالیٰ سے مدد کی دعائیں مانگتا رہا۔

اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں اس خیمے میں گیا جو چیف ایویکیویشن افسر، مسٹر ملر کا خیمہ تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو میں نے فون کی گھنٹی کی آواز سنی۔ وہاں فون سننے والا کوئی نہیں تھا اس لئے میں نے فون اٹھایا۔ ڈپٹی فنانشل ایڈوائزر، ممتاز مرزا بول رہے تھے، جو بعد میں حکومت پاکستان کے سیکریٹری خزانہ بنے۔ وہ سخت بے بسی کے عالم میں مدد کی درخواست کر رہے تھے اور انہوں نے بتایا کہ اس علاقے سے سب کے سب مسلمان افسر جا چکے ہیں۔ ان کے گھر لوٹے جا چکے ہیں اور ان کے گھر میں دو اور مسلمان خاندان بھی موجود ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ مسٹر ملر سے بات کریں مگر انہوں نے بتایا کہ مسٹر ملر پہلے ہی انکار کر چکے ہیں کیونکہ ان کے پاس کوئی حفاظتی دستہ موجود نہیں ہے۔ میں نے مرزا صاحب سے کہا کہ وہ اطمینان رکھیں میں کچھ دیر میں ان کے پاس پہنچ جاؤں گا۔

میرے پاس کھڑے ایک دوست نے کہا کہ میں ان سے ایسا وعدہ کیوں کیا جسے خود پورا کرنے کے لئے میرے پاس کوئی وسائل نہیں ہیں۔ میں نے اسے کہا کہ یہ صرف اس کی ہمت بندھانے کے لئے تھا اور اسے یہ امید دینے کے لئے کہ مدد آنے ہی والی ہے۔ جلد ہی میرے دماغ میں ایک سکیم آئی۔ میں نے اپنے ایک دوست سید شمشاد علی سے جو اس وقت اسسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس تھے، اور انہوں نے بھی

کیمپ میں پناہ لے رکھی تھی، کہا کہ وہ مجھے اپنی بندوق اور گولیوں کی پیٹی دے دیں۔ میں واپس خیمے میں گیا جواب بھی خالی تھا۔ میں فون کی طرف یہ سوچ کر بڑھا کہ میں ڈرائیور سے کہوں گا کہ مسٹر ملر نے گاڑی منگوائی ہے اور جیسے ہی ہم ہٹمنٹ سے باہر نکلیں گے میں اسے بندوق کی نوک پر مجبور کروں گا کہ وہ میرے دوستوں اور ان کے خاندانوں کو لائے۔ میں خیمے سے باہر آیا اور ڈرائیور سے وہی کچھ کہا جو میں نے سوچا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گیا مگر مجھے یہ سمجھ نہ آسکی کہ میں اسے کس طرح مجبور کروں۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی ہمت مجتمع کرتا، ڈرائیور مسٹر ڈنڈاس کے بنگلے پر پہنچ گیا، جہاں مسٹر ڈنڈاس اور مسٹر ملر ٹہل رہے تھے۔ جیسے ہی مسٹر ملر نے گاڑی دیکھی وہ اس کی طرف چل پڑے جیسے وہ اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ جب وہ گاڑی میں بیٹھ گئے تو میں نے مسٹر مرزا کی درخواست کے بارے میں بتایا۔ مسٹر ملر نے فوراً کہا کہ وہ مسٹر مرزا کو بتا چکے ہیں کہ ان کے پاس کوئی حفاظتی دستہ نہیں ہے۔ میں نے مسٹر ملر سے درخواست کی کہ وہ اپنی گاڑی مجھے دے دیں کیونکہ میرے پاس بندوق ہے۔ اور مرزا صاحب کا گھر نارتھ بلاک کے بالکل نزدیک ہی ہے۔ (اگرچہ مرزا صاحب کا گھر ہرگز بھی اتنا نزدیک نہیں تھا جتنا میں کہہ رہا تھا) مسٹر ملر چپ رہے مگر جب وہ گاڑی سے اترنے لگے تو انہوں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں ڈرائیور سے کہا کہ وہ مجھے جہاں بھی جانا چاہوں لے جائے۔ میں نے ڈرائیور کو ساتھ لیا اور مرزا صاحب کے ہاں موجود خاندانوں کو وہاں سے نکال لایا، ان میں مرزا صاحب کا اپنا خاندان بھی تھا۔ ان کے پاس ایک کار اور ایک سٹیشن ویگن تھی۔ میں نے انہیں کیمپ سے کوئی ایک سو گز کے فاصلے پر اتارا اور ڈرائیور سے کہا کہ مجھے پہاڑ گنج لے جائے۔ شام چھ بجے تک میں کم از کم پچیس خاندانوں کو نکال لایا تھا۔ میں مسٹر ملر کے پاس پہنچا اور ان سے اتنی دیر کرنے پر معذرت کی انہیں بتایا کہ سارا دن میں نے کیا کچھ کیا۔ میرے دن کی روداد سن کر مسٹر ملر نے فوراً میرے خدمات مانگ لیں جو میں نے باخوشی انہیں پیش کر دیں۔ انہوں نے مجھے تعیناتی کا ایک خط اور ایک اتھارٹی لیٹر دیا جس پر جوائنٹ ڈیفنس کونسل کی مہر ثبت تھی۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ان کے پاس کچھ ٹرک موجود ہیں مگر محافظ نہیں ہیں۔ میں نے کچھ ڈرائیوروں سے رابطہ کیا۔ جہلم کے رہنے والی لانس نائیک رحمت خان نے محافظوں کے پرواہ کئے بغیر اپنی خدمات پیش کیں۔ پھر دو ڈرائیور اور بھی آئے۔ ان میں سے ایک وہی نیپالی تھا

جو مجھے گزشتہ رات مسٹر ملر کی وین میں لے کر گیا تھا۔ مسٹر ملر کی بڑی مہربانی تھی کہ انہوں نے اپنی وین، ڈرائیور اور دوسرے لوگوں کو میرے ساتھ کام کرنے کی اجازت دی۔

میں ساری مشکلات کے باوجود دن رات کام کرتا رہا۔ ایک دفعہ تو جاٹ رجمنٹ کا ایک ہندو صوبیدار مجھے دو ٹرکوں اور ایک وین میں بھرے ہوئے مسلمان عورتوں، بچوں اور بوڑھوں سمیت ایک تھانے لے گیا۔ اس نے ایس پی کے کان میں کچھ کہا جس کے بعد ایس پی نے مجھے حوالات میں بند کرنے کا حکم دے دیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ جوائنٹ ڈیفنس کونسل نے مجھے انخلاء کے کام کا اختیار دیا ہے اور یہ کہ مجھے سپریم کمانڈر جنرل سر کلاڈ اوکن لیک کے ساتھ ایک میٹنگ میں پہنچنا ہے (میری بات کا یہ حصہ سچ نہیں تھا)۔ ایس پی نے معذرت کی اور مجھے چھوڑ دیا۔ میں نے پولیس کی حفاظت کے بغیر جانے سے انکار کر دیا۔ مجھے بتایا گیا کہ جو حفاظتی دستہ موجود ہے وہ سکھ کانسٹیبلوں پر مشتمل ہے۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی صرف یہ ضروری تھا کہ اگلے ٹرک میں دو سرخ پگڑی والے موجود ہوں (سرخ پگڑی پولیس کانسٹیبل کے یونیفارم کا حصہ تھی) اس نے دو سکھ کانسٹیبل میرے ساتھ کر دیے جو اگلے ٹرک میں کھڑے ہو گئے۔ جب یہ چھوٹا سا قافلہ C-2 پہنچا تو مجھے پتا چلا کہ سر کلاڈ اور ہندوستان کے وزیر اعظم نہرو کیمپ کا معائنہ کر رہے ہیں۔ اچانک میں نے دیکھا کہ وہ گیٹ پر موجود ہیں میں ابھی وین سے اترا ہی تھا کہ نہرو نے سکھ کانسٹیبلوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ سکھ کانسٹیبل مسلمانوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔ میں نے فوراً وضاحت کی اور ادب کے ساتھ انہیں بتایا کہ میں کس طرح حوالات سے بچ کر آیا ہوں اور جناب والا کا نام استعمال کر کے محافظ حاصل کیے ہیں۔

کوئی ایک گھنٹہ گزرا ہو گا کہ مسٹر ملر نے مجھے بلایا اور انخلاء کی پوری ذمہ داری میرے سپرد کر دی کیونکہ انہیں کچھ مزید ذمہ داریاں دے دی گئی تھیں۔ مسٹر رچرڈ جن کے ماتحت مجھے کام کرنا تھا، انخلاء اور مہاجر کیمپوں کے انچارج تھے۔ چونکہ ہمنٹ میں اتنے زیادہ لوگ نہیں سما سکتے تھے اس لیے کیمپ کو C-2 سے پرانے قلعے میں منتقل کر دیا گیا۔

پرانے قلعے میں دائیں طرف کا حصہ عام مسلمانوں نے لے لیا اور بائیں طرف کے حصے میں وہ سرکاری ملازمین ٹھہر گئے جو C-2 سے یہاں آئے تھے۔ مجھے کیمپ کا انتظام چلانے اور مہاجرین کے انخلاء کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اگلے روز مجھے یہ خبر دی گئی کہ کچھ لوگوں کا ایک گروہ مجھے زندہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ تاہم ٹھاکر باتک سنگھ۔ ڈپٹی فنانشل ایڈوائزر میری مدد کے لئے پہنچے اور مجھے اس مقام تک پہنچایا جہاں گاڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔

مسٹر چرڈ نے مجھے خاصی رقم دی کہ میں بچوں کے لئے دودھ خرید لاؤں۔ میں اور ڈرائیور رحمت خان شام کو بیگم آباد کیلئے روانہ ہوئے۔ بیگم آباد دہلی سے باہر ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، جہاں ایک کارخانے میں دودھ ٹین کے ڈبوں میں پیک کیا جاتا تھا۔ میں نے ٹرک بھر کر دودھ خرید لیا، جس میں سے آدھا تو مفت تقسیم کیا گیا اور آدھا دوگنی قیمت پر فروخت کر دیا گیا۔ اس طرح کچھ ہی دنوں میں میں مسٹر چرڈ کو رقم واپس کرنے کے قابل ہو گیا۔

اگلے روز ایک گاڑی میں کچھ ڈاکٹر میرا پوچھتے ہوئے کیمپ میں آئے۔ گیٹ والے نے انہیں میرے کیمپ کا پتہ بتایا۔ میڈیکل ڈاکٹروں کو اپنی گاڑیوں پر ریڈ کراس کے سٹکر لگانے کی اجازت تھی۔ میں نے ان میں سے اپنے دوست ڈاکٹر چاولہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ڈاکٹر چاولہ میرے ذاتی معالج بھی تھے۔ انہوں نے جناح کیپ پہن رکھی تھی۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ کوئی ہندو یا سکھ مسلمانوں کے مہاجر کیمپ کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو سکتا تھا کجا یہ کہ وہ کیمپ کے اندر پہنچ جائے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ان کے گھر چلوں جہاں ان کی والدہ اور گھر کے دوسرے افراد میری خیریت کے لئے پریشان ہیں اور مجھے دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیمپ میں موجود میرے دوستوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ان کے ساتھ نہ جاؤں مگر میں نے ان کی بات نہ مانی اور ڈاکٹر چاولہ کے ساتھ ان کے گھر رات گزارنے چلا گیا۔ اگلی صبح ان کے گھر والوں نے دعاؤں اور آنسوؤں کے ساتھ مجھے رخصت کیا۔ ان کے والدہ نے مجھے ایک لفافہ دیا جس میں اس زمانے کے لحاظ سے خاصی بڑی رقم تھی۔

ستمبر کے تیسرے ہفتے میں مجھے پاکستان چلے جانے کا مشورہ دیا گیا۔ کفایت اور میں بستی نظام الدین سے ایک گاڑی میں سوار ہوگئے۔ سب انسپکٹر پولیس، پنڈت جگن ناتھ، دہلی ریلوے سٹیشن پر مجھ سے ملنے آئے کیونکہ میں نے اپنے سفر کے بارے میں انہیں اطلاع بھجوادی تھی۔ انہوں نے ہمیں مشورہ دیا کہ ریل گاڑی سے اتر جائیں اور ریلوے پولیس کے کواٹر میں آرام کریں جس کا انتظام پہلے سے کرلیا گیا تھا۔ دو دن بعد ہمیں ایک ٹرین میں سوار کرایا گیا جو پاکستان جا رہی تھی اور ایک سیکنڈ لیفٹنٹ کے سرکردگی میں پانچ فوجی محافظ اس گاڑی کے ساتھ تھے۔ اس کے باوجود اس ٹرین پر سرہند کے ریلوے سٹیشن پر، جہاں وہ آدھی رات کے وقت پہنچی تھی، حملہ کردیا گیا۔ اس حملے کے نتیجے میں چار آدمی ہلاک ہوگئے اور ہمیں خوب اندازہ تھا کہ یہ ہمارے اس دردناک اور طویل سفر کی ابتدا ہے۔

اس ٹرین کو جالندھر پہنچنے میں 75 گھنٹے سے زیادہ وقت لگا۔ اس سٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے لاہور کے جانب چلے تو گاڑی کا انجن اور چار بوگیاں پٹری سے اتر گئیں اور اس کے ساتھ ہی گاڑی پر ایک بڑے ہجوم نے حملہ کردیا۔ میں ٹرین کی پانچوں بوگی میں تھا اور مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں نے بندوق کی گولیاں چلنے کی آوازیں سنیں۔ مسلح سکھ ٹرین کے اندر گھس آئے۔ ہر طرف چیخ و پکار تھی، چھرے، کرپانیں اور بھالے تھے۔ جوان لڑکیوں کو زبردستی باہر نکالا گیا۔ میں فرش پر گر گیا اور کفایت نے بھی یہی کیا۔ ہم خون میں لت پت جسموں کے درمیان لیٹے ہوئے تھے تاکہ کوئی ہمیں ڈھونڈ نہ سکے۔ کچھ لوگ ہمارے جسم پر سے گزر رہے تھے۔ کچھ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا اس کے بعد امن ہوگیا۔ ہمیں پتہ چلا کہ ہمارے کمپارٹمنٹ میں سے زیادہ تر لوگ یا تو مارے جاچکے ہیں یا اتار لئے گئے ہیں۔

مگر ہمارا خوفناک تجربہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ کچھ لوگ بھوک، پیاس اور خوف سے دم توڑنے لگے۔ دوسرا انجن پہنچنے میں کم از کم سولہ گھنٹے لگے اور وہ بھی اس وقت کہ مشرقی پنجاب کے نئے نائب گورنر مسٹر ترویدی خود جائے وقوعہ پر آئے۔ ٹرین اٹاری پہنچی تو انجن اور فوجی محافظ واپس لوٹ گئے۔ صرف سیکنڈ لیفٹنٹ جو کہ مسلمان تھا ہمارے ساتھ رہا۔ وہ اکیلا شخص تھا جو وردی میں تھا اور جس کے پاس

بندوق تھی۔ تمام مسافر تھکے ہوئے، شدید پریشان، بھوکے پیاسے اور کمزور تھے۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے مر رہے تھے۔ جو کوئی بھی خود کو گھسیٹ کر باہر نکال سکتا تھا اتاری کے پلیٹ فارم پر پڑا تھا۔

پھر ایک اور حملہ ہوا اور اس مرتبہ کچھ لڑکیاں اٹھا لی گئیں۔ لاہور سے ایک انجن آیا۔ ہم اگلی صبح تقریباً چار بجے لاہور پہنچے۔ میرے کپڑے۔ بال اور چہرہ اپنے ساتھیوں کے خون سے اٹے ہوئے تھے۔

میرا سفر ختم ہوا مگر اس کے زخم میرے ساتھ ساتھ ہیں۔ جو دکھ اور تباہی میں نے دیکھی اسے بہت سے لوگوں نے محسوس کیا۔ زندگی چل رہی ہے مگر یادیں باقی ہیں۔

—— ضیاء الحق

تقسیم کے بعد ایک سفر

ہردواری لال لائل پور پاکستان سے ہندوستانی پنجاب میں گوڑ گاؤں تک کے اپنے سفر کی روداد بیان کرتے ہیں جس میں تشدد کی بازگشت انہیں اپنی تقرری کے مقام پر بھی سکون نہیں لینے دیتی۔

برصغیر کی تقسیم، جس کے ساتھ ہی 1947 میں انگریز حکمرانوں کی واپسی بھی ہوئی، قدرتی طور پر ان لوگوں کے ذہنوں میں بار بار گونجتی ہے جنہوں نے اس کے نتیجے میں مصیبتیں اٹھائیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو آج تک اپنی املاک کے کلیم طے ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہاں اخبارات و رسائل میں اس زمانے کے خوفناک واقعات کے بارے میں بہت کچھ شائع ہوتا رہتا ہے اور ہمیں نہیں معلوم پاکستانی میڈیا 15 اگست 1947 سے پہلے اور بعد کے ہولناک واقعات کے بارے میں کیا کچھ چھاپتا ہے۔ ہندوستان کا پریس تو ایسے واقعات اور آراء سے بھرا ہوتا ہے جن میں پاکستان کے مسلمانوں کو تقسیم کے وقت ہونے والی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ حقائق کو واضح کیا جائے، خاص طور پر اس صورتحال میں جب دونوں ملکوں کے درمیان نتیجہ خیز امن مذاکرات ہو رہے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ کسی ایک فریق پر مکمل ذمہ داری نہیں ڈالی جا سکتی۔ جولائی، اگست اور ستمبر 1947 میں ہونے والے المناک واقعات کے لئے دونوں فریق برابر کے ذمہ دار تھے۔ صرف وہی لوگ جنہوں نے اس قسم کے واقعات خود اپنی آنکھوں سے ان فیصلہ کن مہینوں میں ہوتے دیکھے، اس بارے میں کچھ سچ بتا سکتے ہیں بلکہ وہ بھی صرف اتنا ہی سچ بتا سکتے ہیں جتنا اس مقام پر ہو رہا تھا جہاں وہ موجود تھے۔

میں ان دنوں مارچ سے 23 اگست 1947 تک، ملک کے غلہ گھر، لائل پور میں کالونی افسر اور مجسٹریٹ کے طور پر متعین تھا۔ یہ ایسا عہدہ تھا، جس سے میں ایک ایسے اہم علاقے میں جسے بہت جلد مغربی پنجاب کا حصہ بننا تھا، روزمرہ واقعات کو بڑے نزدیک سے دیکھ سکتا تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اس مسلمان اکثریت والے علاقے میں میرا قیام بڑا خوشگوار تھا۔ 2 ستمبر 1947 کو دونوں وزرائے اعظم فسادات کو رکوانے کے لئے لائل پور میں موجود تھے۔ شائد یہ بات قابل یقین معلوم نہ ہو مگر 23 اگست 1947 تک نہ صرف ضلع لائل پور میں بلکہ اس کے آس پاس کے دوسرے اضلاع میں بھی مکمل امن وسکون تھا۔ یہاں تک کے صوبے کے دوسرے حصوں میں ہونے والے فسادات کی خبروں نے بھی یہاں کے امن کو خراب نہ کیا۔

صوبے کے مختلف حصوں میں فسادات کی خبروں سے دلبرداشتہ ہو کر میں نے اور میرے کئی غیر مسلم دوستوں نے اپنے گھر والوں کو مشرقی پنجاب میں اپنے آبائی شہروں میں بھیج دیا تھا۔ مگر ہم پہلے کی طرح امن اور عزت سے رہ رہے تھے۔ ہمیں پنجاب کے دونوں حصوں میں سے کسی ایک میں ملازمت کرنے کے بارے میں فیصلے کی جو آزادی دی گئی تھی اس کے نتیجے میں میں نے مشرقی پنجاب میں ملازمت جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں 4 اگست کو لاہور گیا کہ اپنی نئی تقرری کے کیس پر کام کروالوں۔ اس روز لاہور مجموعی طور پر پرامن تھا۔ تاہم اس کے ایک ہفتہ بعد لاہور اور امرتسر میں فسادات کی خبروں نے ہمیں بالکل بوکھلا کر رکھ دیا۔ ہماری خوش قسمتی کہ شوکت حیات خان جو اپنے والد کے برعکس پاکستان کے حامی تھے، 21 اگست کو لائل پور آئے۔ میں ان سے ملا اور التجا کی کہ ہمیں لاہور تک بحفاظت پہنچانے کا بندوبست کیا جائے، جہاں سے میرا خیال تھا کہ میں ہندوستانی پنجاب کے شہر گوڑ گاؤں بحفاظت پہنچ جاؤں گا۔

یوں لگتا تھا کہ وہ صوبے کی بدامنی کی صورتحال سے بے خبر تھے انہوں نے مجھے اپنا فیصلہ بدلنے اور لائل پور میں ہی رہنے کا مشورہ دیا۔ جب میں نے ہندوستان جانے پر اصرار کیا تو انہوں نے ڈپٹی کمشنر سے جو

ایک نوجوان مسلمان آئی سی ایس تھا، کہا کہ میرے اور مجھ جیسے دوسرے افسروں کے لئے، جو ہندوستان جانا چاہتے ہیں، ٹرانسپورٹ کا مناسب انتظام کر دیں۔ اگلے روز مجھے بتایا گیا کہ ایک بس اور ٹرک ہمیں اور ہمارے سامان کو لاہور کے جانے کے لئے تیار ہے۔ انہوں نے ہمیں دو تعارفی خط بھی دیے، ایک لاہور کے ڈپٹی کمشنر کے لئے اور دوسرا پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے چیف سیکریٹری کے لئے، جس میں ان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ ہمارے بحفاظت امرتسر پہنچنے کے لئے انتظامات کریں۔

22 اگست 1947 کا دن مجھے ایک مشفقانہ میزبانی کے دن کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رہے گا۔ میرے دفتر کا عملہ جو میرے جانے پر سچ مچ دکھی تھا، مجھے اور میرے ایک اور پڑوسی سکھ ساتھی کو کھانے کی دعوت دینے پر مصر تھا۔ اسی طرح مسلم لیگ کے عہدیدار بھی یہ سن کر میرے ہاں اکٹھے ہو گئے۔ میرا تعلق ضلع رہتک سے تھا جہاں کے یونینسٹ لیڈر سر چھوٹو رام بھی رہنے والے تھے، جنہیں ان ہی لوگوں نے آج سے پانچ برس پہلے لائل پور میں "رہبر اعظم" کا خطاب دیا تھا۔ وہ اپنی وفاداریاں تبدیل کرنے پر واقعی معذرت خواہ تھے۔ بہرصورت، اس موقعے پر ہونے والی تقریب میرے ذہن سے کبھی بھی نہیں اتر سکتی۔ اگلی صبح، 23 اگست 1947 کو، نوجوان مسلم لیگیوں کا ایک دستہ میرے گھر آیا اور اصرار کیا کہ وہ لاہور تک ہمارے ساتھ جائیں گے۔ انہیں یہ بات منوانے میں کہ وہ ہمارے ساتھ نہ جائیں ہمیں خاصی دیر لگی۔ لائل پور سے لاہور تک کے محفوظ سفر نے یہ بات ثابت کر دی کہ ہمیں ان کی واقعی ضرورت نہیں تھی۔ ہم شیخوپورہ سے گزرے جو اس کے ایک ہفتہ بعد ہندوؤں اور سکھوں کے قتل عام اور ان کی عورتوں کی اجتماعی آبروریزی کا میدان بن گیا۔ خیر ہم بخیر و عافیت لاہور پہنچ گئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم شہر میں داخل ہوتے، ڈیوٹی پر موجود پولیس نے ہمیں روک لیا۔ جب ہم نے انہیں لائل پور کے ڈپٹی کمشنر کا تعارفی خط دکھایا تو ہمیں جانے دیا گیا مگر اس تنبیہ کے ساتھ کہ ہم کشیدگی والے علاقوں کی طرف نہ جائیں اور سیدھے ڈی اے وی کالج کے گراؤنڈ میں قائم مہاجر کیمپ چلے جائیں۔

جیسا کہ ہمیں مشورہ دیا گیا تھا کہ ہم سیدھے مہاجر کیمپ چلے گئے جہاں منتظمین نے ہمیں بری طرح دھتکارا۔ انہوں نے ہم سے ہماری ذات برادری کے بارے میں پوچھا اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ہم جنوب مشرقی پنجاب کے کسانوں میں سے ہیں تو انہوں نے مکمل بے رخی اختیار کر لی۔ انہوں نے ہمیں کہا کہ فرش پر ڈیرے ڈال دو اور اس وقت کا انتظار کرو جب تم لوگوں کے امرتسر جانے والے کارواں کا حصہ بننے کی باری آئے۔ یہ امکان کہ یہ باری کئی دنوں بعد بھی ہو سکتی ہے خطرناک تھا۔ پہلی مرتبہ ہمیں اس بارے میں پریشانی ہوئی کہ سفر خطرناک ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا میں ڈیوٹی پر موجود مجسٹریٹ سے مل سکتا ہوں۔ کسی نے نفرت آمیز لہجے میں کہا کہ "ہاں اگروال ہاسٹل میں ایک مسلا مجسٹریٹ بیٹھا ہے"۔ ان کی مسلمانوں کے خلاف کھلی نفرت اور ہماری جانب غیر ہمدردانہ رویے نے ہم پر تقسیم کی بنیادی وجوہ واضح کر دیں اور یہ کہ اگر مسلم پنجاب اس تحریک میں فعال حصہ نہ لیتا تو تقسیم کبھی نہ ہو پاتی۔ جناح اپنی مسلم لیگ کیلئے پنجاب کی حمایت حاصل کرنے کی ناکام کوششیں 1935 سے کرتے چلے آ رہے تھے۔ پہلے سر فضل حسین اور پھر یونینسٹ لیڈروں نے ان کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔

پنجاب میں ملتان اور راولپنڈی ڈویژن کے ہندوؤں نے سادہ مسلمان کسانوں کو مکمل طور پر اپنے سے الگ تھلگ رکھا ہوا تھا۔ جناح نے مسلم بھائی چارے کا نعرہ لگا کر ان کے مذہبی جذبات کو کامیابی سے استعمال کیا، خصوصاً اس صورت حال میں جب یونینسٹ پارٹی، جسے زمیندار لیگ کہا جانے لگا تھا، کی کوئی موثر قیادت باقی نہیں رہی تھی۔ آدھی صدی سے شاطر ہندو مسلمان کسانوں کا استحصال کرتے چلے آ رہے تھے۔ وہ ایک معمولی دکاندار کی حیثیت سے گاؤں میں داخل ہوتے اور سود کا کاروبار کرتے اور کسانوں کا استحصال کرتے ہوئے رفتہ رفتہ پورے گاؤں کے مالک بن جاتے۔ اب اس بنئے سے بدلہ لینے کا وقت تھا۔

مسلے مجسٹریٹ کو مل کر خوشی بھی ہوئی اور دکھ بھی ہوا۔ اس نے ہمیں کھلے دل سے خوش آمدید کہا اور ہمیں کھانا بھی کھلایا جس کی اسوقت ہمیں شدید ضرورت بھی تھی۔ پھر اس نے ہمیں اپنی مشکلات کی کہانی سنائی وہ امرتسر میں سیلز ٹیکس افسر تھا، اس کا بھائی 10 اگست کو کچھ سکھ بلوائیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ بہر حال اس نے وزیر اعلیٰ کے چیف سیکرٹری سے رابطہ کیا اور ہمیں بے حد اطمینان ہوا جب اس نے ہمیں یہ بتایا کہ ہماری دونوں گاڑیاں امرتسر جانیوالے پہلے قافلے میں شامل کر دی گئی ہیں۔ لاہور سے امرتسر جانے والی سڑک ایک خوفناک منظر پیش کر رہی تھی۔ دونوں طرف سے قافلے لوگوں کو لے کر جا رہے تھے اور یہ قافلے پنجاب کے دونوں حصوں میں اپنی اپنی افتاد کی کہانیاں ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں کو سنا کر ان کے جذبات مشتعل کر رہے تھے۔ سرحدی فورس کے مسلح اہلکاروں کی موجودگی سارے رستے نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔

امرتسر میں ہم نے رات خالصہ کالج میں گزاری ہمیں معلوم ہوا کہ مشرقی پنجاب، ریاست پٹیالہ، الور وغیرہ اور دہلی میں کیا کچھ ہو چکا ہے اور ابھی تک ہو رہا ہے۔ دہلی میں اپنے گھروں سے اجڑنے والے مسلمانوں کیلئے جولائی میں جو مہاجر کیمپ قائم کیا گیا تھا وہ کچھا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہ مسلمان جو کسی نہ کسی طرح اس قتل عام میں زندہ بچ گئے تھے وہ تیزی سے مغربی پنجاب کی طرف نقل مکانی کر رہے تھے۔ اس سے یہ سب کچھ ذہن میں آجاتا تھا کہ لائل پور اور شیخوپورہ میں جنہیں ہم نے 23 اگست کو مکمل امن کی حالت میں چھوڑا تھا وہاں ایک ہفتے کے بعد جو کچھ ہوا وہ کیوں ہوا۔ دس دن بعد ہمیں معلوم ہوا کہ لائل پور میں حالات اتنے بگڑ گئے تھے کہ دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم نے اس شہر کا مشترکہ دورہ کیا۔ بہر حال اگلی صبح ہم امرتسر کے لئے روانہ ہو گئے۔ میرا سکھ دوست جالندھر میں اتر گیا اور میں انبالہ چلا گیا۔ امرتسر سے انبالہ جانے والی جی ٹی روڈ پر بے شمار بسیں اور ٹرک تھے جو راولپنڈی اور لاہور ڈویژن سے آنے والے ہندو اور سکھ مہاجرین کو لے جا رہے تھے۔ ان کی مصیبتیں اور ان کے نتیجے میں ان کی نقل مکانی سے ہندوستان میں صورت حال مزید بگڑ رہی تھی۔

اور جو کچھ میں نے اپنی تقرری کے ضلع گوڑگاؤں میں آنکھوں سے دیکھا، جہاں مجھے ڈسٹرکٹ ریونیو آفیسر کی حیثیت سے مغربی پاکستان سے نقل مکانی کر کے آنے والے ہندوؤں اور سکھوں اور ہندو رہن سہن اور ثقافت کے حامل مسلمانوں کی نقل مکانی کیلئے امدادی کیمپوں کا انتظام کرنا تھا، وہ اتنا خوفناک تھا کہ اس کی تفصیلات آج بھی میرے لیے سوہان روح ہیں۔

——— ہردواری لال

خون ریزی کو روکا جاسکتا تھا

آزادی سب لوگوں کی آرزو تھی، مگر خونریزی وہ خوفناک المیہ تھی جسے وقوع پذیر نہیں ہونا چاہیے تھا۔ دہلی کے سابق وزیراعلیٰ 1947 میں اپنے خاندان کی لائل پور سے نقل مکانی کے بارے میں بتاتے ہیں۔

میں اپنی زندگی کے لئے ایک گورکھا جوان کا مرہونِ احسان ہوں جس کی بہادری اور حاضر دماغی کے بغیر میں موت کے چنگل سے نہیں نکل سکتا تھا۔ جب بھی میں اپنے اس سفر کے بارے میں سوچتا ہوں،
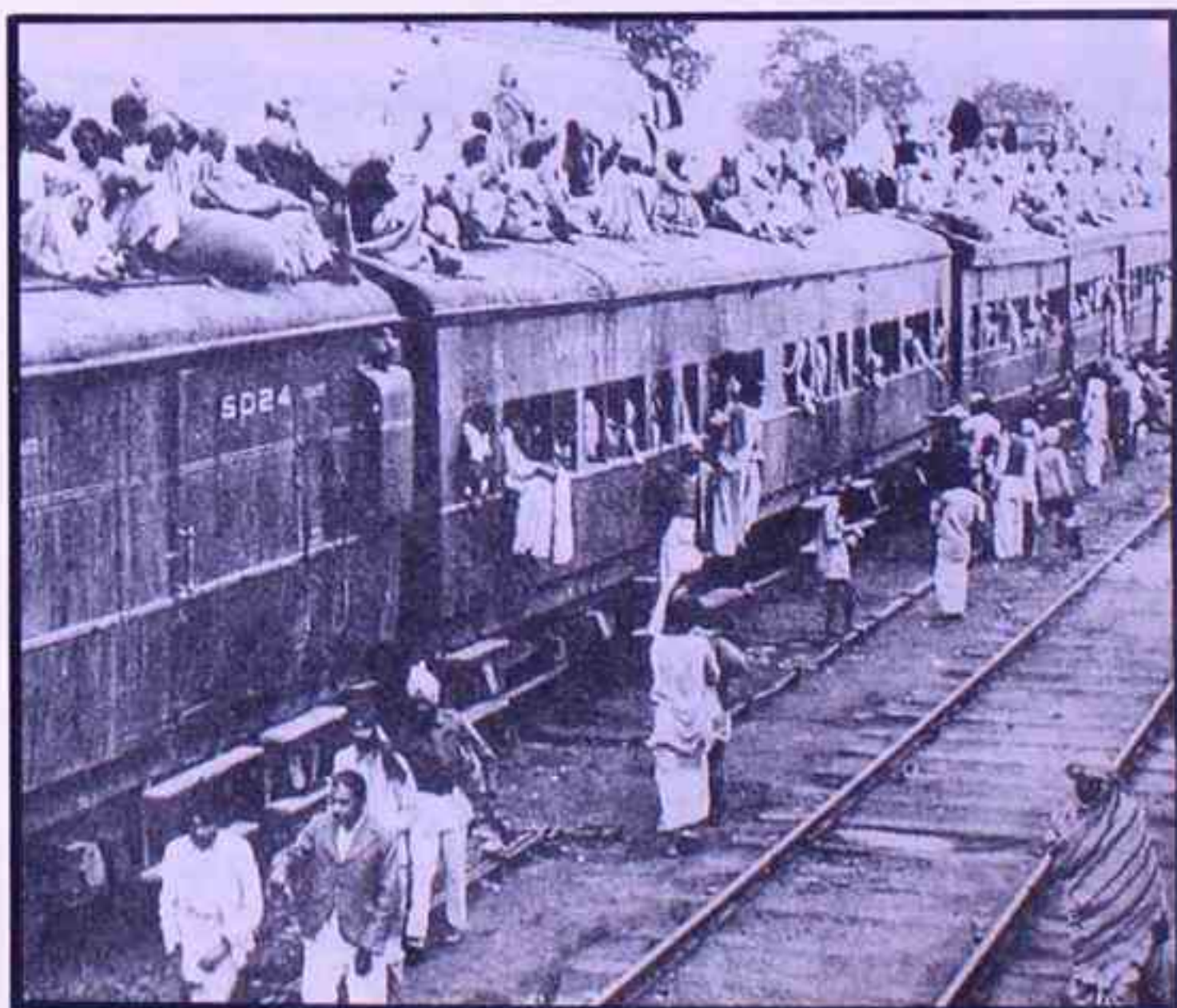
جس میں تقسیم کے دوران میرے اردگرد انسانوں کی لاشیں ہی لاشیں تھیں تو میں اس نوجوان سپاہی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس نے یکدم چھلانگ لگا کر بہت سی جانوں کو بچالیا۔

میں صرف گیارہ برس کا تھا اور میں نے چوتھی جماعت کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس وقت ہم لائل پور میں انار کلی بازار کے نزدیک رہا کرتے تھے، جب مغربی پنجاب میں فسادات پھوٹ پڑے۔ میں نے موت، آتش زنی اور لوٹ مار کا ننگا ناچ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو چکے تھے۔ ایک طرف تلواروں اور پستولوں سے مسلح ہندو لڑکے تھے اور دوسری طرف مسلمان نوجوان تھے، جو اپنے لوگوں کو اپنی تقریروں اور نعروں سے اس بات پر اکسا رہے تھے کہ اپنے مخالف گروہ کے سب لوگوں کو جان سے مار ڈالیں۔ مجھے وہ دن یاد ہیں جب ہمیں ساری رات پہرہ دینا پڑتا تھا تاکہ کوئی ہماری آبادی پر حملہ نہ کر دے۔

ستمبر میں ہمیں قریب ہی ڈی اے وی سکول میں قائم مہاجر کیمپ میں لے جایا گیا۔ ایک بار ہمارے کیمپ پر رات گئے حملہ ہو گیا اور بہت سے بے بس لوگ بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیے گئے۔ ہمیں لائلپور سے امرتسر کے لئے ایک خصوصی ٹرین میں بٹھا دیا گیا۔ یہ ٹرین جگہ جگہ رک رہی تھی۔ ایک دفعہ یہ ایک جنگل کے بیچ میں کھڑی ہو گئی جہاں کوئی سٹیشن نہیں تھا۔ میں چھوٹا سا تھا اور آدھی رات کو مجھے سخت پیاس محسوس ہوئی اور مجھے یاد ہے کہ ہم سب کو مجبوراً ایک تالاب کا گندہ پانی پینا پڑا۔

ہماری ٹرین میں تقریباً نصف درجن گورکھا جوان موجود تھے۔ جب یہ لاہور پہنچی تو ہم پر حملہ کر دیا گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک دونوں طرف سے فائرنگ ہوتی رہی اور اس سارے عرصے میں ہم صرف اپنے خداؤں کو یاد کر رہے تھے۔ اس سے زیادہ ہم کر بھی کیا سکتے تھے، ہمیں احساس بھی تھا کہ ہماری ٹرین میں موجود جوان زیادہ دیر تک مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ اس وقت ہی ان جوانوں میں سے ایک ٹرین سے باہر کودا اور ٹرین کے انجن تک پہنچا اور اپنا ریوالور ڈرائیور کی کنپٹی پر رکھ کر کہا کہ وہ فوراً ٹرین

چلائے۔ امرتسر کے راستے میں اور بھی بہت سے بلوائی تھے اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ ٹرین کو قصور کے راستے فیروز پور کے طرف موڑ دیا جائے۔ اس طرح ہماری جانیں بچ گئیں مگر میں وہ آدھا گھنٹہ نہیں بھلا سکتا جب ہم حقیقتاً موت اور زندگی کے درمیان معلق تھے۔ اگر وہ نوجوان سپاہی اپنا کام نہ کرتا تو ہم میں سے کوئی بھی اس حملے سے بچ نہ پاتا۔

ڈی اے وی سکول کے مہاجر کیمپ میں بھی ہمیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جب بھی ہم ان لوگوں کی دردناک کہانیاں سنتے جو آس پاس کے علاقوں سے چلے آرہے تھے تو ہمارے لئے زندگی اور بھی تکلیف دہ ہو جاتی۔ ایک گاؤں کی سب عورتوں کو بلوائیوں سے بچانے کے لئے کنوئیں میں دھکیل دیا گیا۔ اس طرح ہمارے بہت سے لوگ مارے گئے اور جو بچ گئے انہوں نے کیمپ پہنچنے پر خدا کا شکر ادا کیا۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ جب ہم نے اپنا گھر چھوڑا تو ہم اپنے ساتھ صرف چند چیزیں لے گئے تھے جن کی ہمیں روزمرہ استعمال کے لئے ضرورت تھی۔ ہمیں یہ اندازہ ہرگز نہیں تھا کہ ہم اپنا گھر ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہے تھے۔ بہت سے خاندان ایسے تھے جو پاکستان چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے کیونکہ وہ یہاں عرصہ دراز سے رہ رہے تھے اور وہ اپنے آبائی گھر نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی بیٹیاں بلوائیوں کے ہاتھوں محفوظ نہیں ہیں تو انہیں مجبوراً ترک مکان کرنا پڑا۔

آزادی تو مل گئی مگر اس سے ہمیں کچھ بھی نہیں ملا۔ ایسے وقت جب پوری قوم نئی حاصل ہونے والی آزادی کا جشن منا رہی تھی ہمارے لئے چاروں طرف موت پھیلی ہوئی تھی۔ یہ ہمارے لئے خوشی کا وقت نہیں تھا۔ ہمارے اتنے سارے لوگ مارے جا چکے تھے۔

میرا خیال ہے کہ اگر پاکستان ناگزیر تھا تو اس کے قیام سے بہت پہلے ہی ہمیں واضح طور پر بتا دینا چاہئے تھا کہ جو لوگ پاکستان میں رہنا چاہتے ہیں وہ یہیں رہیں اور وہ سب لوگ جو یہاں سے انڈیا جانا چاہتے ہیں وہ سرحد پار کر جائیں۔ اگر وہ صرف یہ اعلان بروقت کر دیتے تو اتنی ساری اموات نہ ہوتیں۔ وہ سب یقین دہانیاں جو ہمیں کرائی گئی تھیں، کہاں گئیں؟ ہمارے ہزاروں، لاکھوں لوگ نہرو کی یقین دہانی کی وجہ سے یہاں رکے رہے اور دیکھئے ان کے ساتھ کیا ہوا۔

مگر اتنے برس گزرنے کے بعد بھی، مجھے یقین ہے کہ لوگوں کے درمیان محبت کا ناطہ آج بھی قائم ہے۔ اس کے لئے میں ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک مرتبہ میں نے زی ٹی وی کے پروگرام، آپ کی عدالت میں شرکت کی۔ اس شو کے شروع میں رجت شرما نے یہ ذکر کیا کہ میں 1936 میں لائل پور میں پیدا ہوا تھا۔ آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے جب چند دن بعد رجت نے مجھے بتایا کہ زی ٹی وی کو لائل پور سے سینکڑوں خطوط موصول ہوئے جن میں مجھے انڈیا میں اتنا اعلیٰ عہدہ حاصل کرنے پر مبارکباد دی گئی ہے۔ ان سب نے مجھ پر فخر کا اظہار کیا۔ سرحد پار کے لوگوں کے جذبات آج بھی قائم ہیں اور نفرت اور کشیدگی کے اس دور میں یہی ایک حوصلہ افزاء بات ہے۔
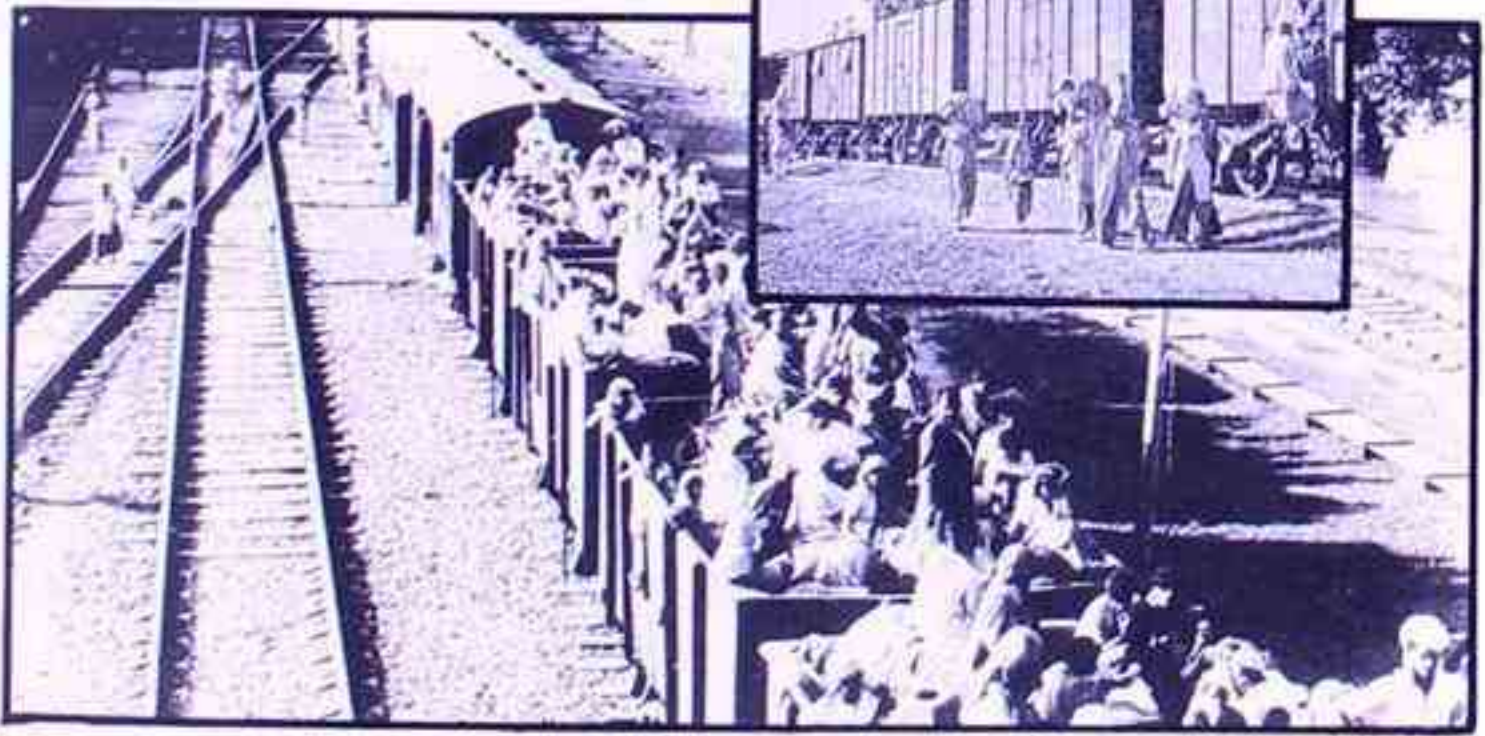
بدقسمتی سے آزادی کو پچاس برس گزرنے کے باوجود آج بھی ہمیں مہاتما گاندھی کا مقرر کردہ مقصد، سوراج حاصل نہیں ہو سکا۔ گو ہم نے برطانوی حکومت سے آزادی حاصل کر لی ہے مگر سوراج کی منزل ابھی بہت دور ہے۔ ہمارے ملک میں آج بھی اختیارات چند ہاتھوں میں مرکوز ہیں اور ہمیں ابھی ان کی مرکزیت کا خاتمہ کرنا ہے۔ ہمارے دیہات کو ابھی تک سوراج نہیں ملا۔ ہماری 45 فیصد آبادی آج بھی خطِ افلاس سے نیچے زندگی بسر کر رہی ہے اور کوئی ان کا خیال کرنے والا نہیں ہے۔ ہم سارا وقت معاشی لبرلائزیشن کے نعرے تو لگاتے رہتے ہیں مگر ہمارے دیہات میں ایک کلوواٹ بجلی کا بھی اضافہ نہیں ہوا ہے۔ ہمارے شہروں میں تو آئس کریم کی فراوانی ہو گی مگر گاؤں میں رہنے والے ہمارے بھائیوں کا کیا حال ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ مگر کیا ہم نے کبھی یہ سوچا کہ ہم نے ان کی کیا قیمت چکائی؟ یہ سب ترقی جس کا ہم ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کس قیمت پر حاصل ہوئی؟

——— مدن لال کھرانہ

1947 کے بلوائی کون ہیں، کہاں ہیں؟

راولپنڈی کے پرانے باسی جو ہندوستان میں وزارت خارجہ کے جوائنٹ سیکریٹری رہ چکے ہیں پوچھتے ہیں کہ جن بلوائیوں نے 1947 میں قتل وغارت کی وہ کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور کہاں گئے؟

میرا خاندان ان لاکھوں خاندانوں میں سے ایک تھا جس کا سب کچھ 1947 میں کھو گیا۔ میرے دادا دادی راولپنڈی میں اپنے گھر سے صرف اپنی جانیں بچا کر بھاگے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ان کے آباؤ اجداد کم ازکم آٹھ پشتوں سے رہ رہے تھے۔ مگر پھر بھی وہ خوش قسمت تھے۔

میرے دادا بتاتے ہیں کہ کس طرح قاتل بلوائی منظم انداز میں گھر گھر جا کر مذہبی قتل و غارت کرتے تھے اور اپنے آس پاس کے ان گھروں کو لوٹتے تھے جو غیر مذاہب والوں کی ملکیت تھے۔ ان کے گھر کے لوگ خاموشی سے نانک کے حضور دعائیں مانگ رہے تھے اور اذیت کے عالم میں اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

انہیں نہایت حیرانی ہوئی کہ وہ مقدر کے ایک عجیب و غریب چکر سے آخری لمحے میں بچ گئے۔ وہ غنڈہ جو بلوائیوں کی رہنمائی کر رہا تھا، اس نے میرے دادا کو کسی پہلی ملاقات کے حوالے سے پہچان لیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ گھر اس کا اپنا ہے اس لئے اسے ہاتھ نہ لگایا جائے۔ اس طرح بلوائی اگلے مکان کی طرف بڑھ گئے۔ مگر میرے سارے رشتہ دار اتنے خوش قسمت نہیں تھے۔ نزدیکی بستی تھالی جہاں میری خالہ اور ان کا سسرالی خاندان رہتا تھا ایسا خوش قسمت نہ تھا۔ ان کے بھائی صوبیدار دیوان پال سنگھ بھاسن دیوانہ نے دوسری جنگ عظیم کے دوران قاہرہ میں لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ میرے والد جو خود بھی اس جنگ میں شریک تھے بتاتے ہیں کہ بھاسن کس طرح اپنے مترنم گانوں سے لوگوں کو محظوظ کیا کرتا تھا۔ اس سے ہی ان کے نام دیوانہ کی وضاحت ہو جاتی ہے جو اس زمانے کے فیشن کے مطابق انہوں نے اختیار کیا تھا۔

ایک شام بھاسن نے بہت دیر تک ممکنہ بلوائیوں سے اس بات پر مذاکرات کیئے کہ وہ ان کے رشتہ داروں کو بحفاظت تھالی سے کلر جانے دیں جو نسبتاً محفوظ مقام تھا اور چند کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ ان کو امید تھی کہ وہاں سے انہیں انڈیا لے جایا جائے گا۔ اس کے بدلے یہ طے پایا کہ وہ اپنا تمام سامان یہیں چھوڑ جائیں گے اور اپنے ہتھیار فوراً ہی بلوائیوں کے سردار کے حوالے کر دیں گے۔ جیسا کہ اکثر فنکاروں کا حال ہوتا ہے کہ وہ اپنے فیصلے زیادہ تر دماغ کے بجائے دل سے کرتے ہیں، انہوں نے سادگی میں یہ بات مان لی۔ دس بجے رات کو وہ جب لوٹے تو ہر کسی کو بتایا کہ صبح چلنے کے لئے تیار

رہیں۔تاہم آدھی رات تک ساری سازش کھل گئی،خبر ملی کہ ایک بہت بڑا مسلح ہجوم بستی کے باہر پہنچ چکا ہے۔

بھاسن اوران کے رشتہ دارتقریباً40 مرد،عورتوں اور بچوں کے پاس صرف چندمنٹ تھے،یا شاید آدھا گھنٹہ تھا۔ان میں اس کی بیوی ایشر کور،چار بیٹیاں اور ایک نوعمر بیٹا رنجیت سنگھ تھا،اس کا بھائی گیان سنگھ،اس کی بیوی نانکی اوران کے دو بیٹے جیت سنگھ اور تفلوک سنگھ اوران کی بیویاں تھیں،گیان سنگھ کے دو پوتے تھے(جیت سنگھ کے بیٹے)،بھاسن کے دوسرے بھائی ہرگوبند سنگھ کی بیوی،بیٹی اور بیٹا تھے جو خودخوش قسمتی سے دہلی میں فوج کی ملازمت پر تھا۔

اب ایک متفقہ فیصلہ کیا گیا۔مرداور بچے لڑتے ہوئے مر جائیں گے۔عورتیں جنہیں یقینی طور پر عصمت دری،اغواء،اور قتل کا سامنا تھا،خود ذاتی طور پر اور اپنی نوعمر لڑکیوں کیلئے یہ طے کریں گی کہ انہیں کس طرح مرنا ہے۔ان کے سامنے دوراستے تھے۔ایک تو یہ کہ مقامی سکھ قصائی اپنے مددگار کے ساتھ ان سب کے باری باری سرتن سے جدا کرنے کو تیار بیٹھا تھا۔دوسرا یہ کہ وہ مقامی گوردوارے میں جا کر خود کو آگ لگالیں۔صرف چند بچوں کو ان کے مسلمان پڑوسیوں نے پناہ دے دی۔

مختصر سی دعا کے بعد قصائی اوراس کے مددگار اپنی خوفناک ڈیوٹی پر لگ گئے۔انہیں احساس تھا کہ بڑھتے ہوئے ہجوم کے ہاتھوں اپنے انجام سے پہلے پہلے انہیں یہ کام مکمل کرنا ہے۔بھاسن نے اپنے نوعمر بیٹے رنجیت کی یہ ذمہ داری لگائی کہ وہ ان عورتوں کو گوردوارے تک پہنچا کرآئے جو خود کو آگ لگا کر مرنا چاہتی تھیں۔اس سے پہلے کہ رنجیت واپس پہنچتا،ہجوم نے تمام دوسرے مردوں اورلڑکوں کو قتل کر دیا تھا اوران کا خیال تھا کہ رنجیت بھی مر چکا ہے مگر وہ یہ کہانی سنانے کے لئے زندہ بچ گیا۔

اس دوران لڑکیوں اور عورتوں نے خود کو مقامی گوردوارے میں بند کرلیا تھا اور اپنی دعائیں پڑھنے کے بعد انہوں نے مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگالی۔ آگ نے ذرا دیر میں ہی ساری عمارت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بھاسن کی تین چھوٹی بیٹیوں، اندر، ہربجھن اور سریندر نے اپنی ماں کی بہت منتیں کیں کہ وہ اس تکلیف دہ موت کو برداشت نہیں کرسکتیں اور آخر ان کی ماں نے دلبرداشتہ ہوکر ان بچیوں کو گوردوارے سے باہر نکال دیا۔ سترہ سالہ کور نے اپنی ماں کے ساتھ مرجانے کو ہی ترجیح دی۔

پورے خاندان میں مردوں میں رنجیت سنگھ اور گیان سنگھ کا ایک کم عمر پوتا زندہ بچے۔ وہ بھی بری طرح زخمی اور نیم مردہ حالت میں تھے۔ جب انہیں اگلی صبح یہاں لایا گیا۔ تین چھوٹی بچیاں بھی بچ گئیں۔ رنجیت سنگھ نے بعد میں انڈین فوج میں ملازمت کرلی اور اب وہ ریٹائرمنٹ کے بعد کپورتھلہ میں رہتا ہے۔ گیان سنگھ کا پوتا آگرہ میں رہتا ہے۔ ان تین چھوٹی بچیوں میں سے جو 1947 میں تھاملی میں زندہ بچ گئی تھیں، اندر حال میں ہی فوت ہوگئی، ہربجھن اپنے خاندان کے ساتھ وراناسی میں رہتی ہے جبکہ سریندر رڑکی میں رہتی ہے۔ بھاسن کے فوجی بھائی، ہرگوبند سنگھ نے جس کا پورا خاندان اس رات مارا گیا تھا، بعد میں دوسری شادی کی اور بال بچے پالے۔ اس رات تھاملی میں کل 36 مرد، عورتیں اور بچے مارے گئے۔

قتل و غارت کا سلسلہ مہاجروں کے ساتھ ریڈکلف کی طے کردہ سرحد تک پورے راستے چلا۔ میری کزن اندر اس وقت تقریباً بیس سال کی ہوگی۔ ان کا مہاجر قافلہ پشاور سے پنڈی آتے ہوئے اچانک اٹک کے مقام پر دریا پار کرتے ہوئے رک گیا۔ بندوقوں اور چاقوؤں سے مسلح بدمعاش، اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے ان پر ٹوٹ پڑے۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح اسے بھی گولی لگ گئی مگر وہ مری نہیں بلکہ بے ہوش ہوکر گرگئی۔ اس کا شوہر اوتار سنگھ غالباً اس قافلے کا واحد شخص تھا جو اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ چھپنے میں کامیاب ہوگیا۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ جب ہجوم لوٹ مار کے لئے پہنچا تو اس نے اپنی بہن کو چلانے سے روکنے کی کوشش میں اس کا گلا تقریباً گھونٹ دیا تھا۔ تمام مرد جن میں

زیادہ تر سکھ اور ہندو تھے، مار دیے گئے۔ وہ لوگ جو زخمی تھے مگر ان میں زندگی کے آثار باقی تھے ان پر بندوق یا چاقو سے آخری وار کر دیا گیا۔ عورتیں اور لڑکیاں جو زندہ تھیں انہیں اٹھا لیا گیا۔ اوتار نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک شخص نے اس کی بیوی کو اس کے لمبے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور پھر مردہ سمجھ کر پھینک دیا۔ اندرا اور اوتار زندہ بچ گئے اور دہلی پہنچے جہاں وہ اب دادا اور دادی بن چکے ہیں۔

یہ ان ہزاروں واقعات میں سے چند ایک ہیں جن میں دس لاکھ یا اس سے بھی زیادہ افراد تقسیم کے پاگل پن میں موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ ان میں صرف سکھ ہی نہیں تھے جن میں سے بعض کا ذکر یہاں کیا گیا ہے بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں مسلمان اور ہندو بھی تھے۔

وزارتِ خارجہ کے جوائنٹ سیکرٹری کی حیثیت سے 1983 میں میں سارک کا ایک وفد لے کر اسلام آباد گیا۔ میرا اصل مقصد بالکل واضح اور ذاتی تھا۔ جب دہلی سے گئے ہوئے سائنس و ٹیکنالوجی کے ماہرین افتتاحی اجلاس کے بعد مباحث میں مصروف تھے، میں پنڈی میں اور اپنے آبائی گاؤں میں جو کلر اور گوجر خان میں تھے، اپنے گھروں کی تلاش میں پھرتا رہا۔ ریاض کھوکھر کی مہربانی سے، جو اس وقت دہلی میں پاکستانی سفارت خانے کے کونسلر تھے، مجھے پنڈی کے آس پاس کے علاقوں میں گھومنے پھرنے کی اجازت صرف دو دن کے اندر مل گئی، جو کہ حیران کن بات تھی۔

ہائی کمشنر شرام نے اتاشی خانیجو کو میرے ساتھ کر دیا۔ میں پریزنٹیشن کانونٹ بھی گیا جو اب صرف لڑکیوں کے لئے ہے۔ مگر میں نے اپنی ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی تھی۔ ایک سردار کا وہاں آنا سکول کی ننز (Nuns) اور طالبات سبھی کے لئے عجیب واقعہ تھا۔ میں آدھی چھٹی میں وہاں پہنچا اور انہیں یہ بتایا کہ میں صرف اپنا کلاس روم دیکھنا چاہتا ہوں، میری یہ درخواست بڑی خوش اخلاقی سے مان لی گئی۔ میں کوئی سو گز کے فاصلے پر چل کر کلاس روم تک گیا اور چند منٹ تک ان یادوں میں کھو گیا کہ کس کرسی پر

میں بیٹھا کرتا تھا، وہ کون سی جگہ تھی جہاں پر ٹیچر نے مجھے ہوم ورک نہ کر کے لانے کی وجہ سے تھپڑ مارا تھا۔ پریزنٹیشن کانونٹ کی ننز اور لڑکیوں کی، پنڈی کے بازاروں میں عام لوگوں کی اور کلر، گوجر خان، حسن ابدال، مری اور دوسری جگہوں پر لوگوں کی خوش اخلاقی اور مہمان نوازی متاثر کن تھی۔

میں نے کلر میں ایک گھنٹہ گزارا۔ ایک بزرگ شخص نے مجھے میرا آبائی مکان اور میرے خاندان کے دوسرے لوگوں کے مکانات دکھائے اور مجھے بے حد حیرانی ہوئی کہ وہ ان سب کو نام بنام جانتا تھا۔ ان مکانات کے موجودہ رہائشی بڑے مہربان لوگ تھے اور انہوں نے بااصرار میری مہمان نوازی کی۔

شاید 1947 کے واقعات کے پس منظر میں ان کی گرمجوشی اتنی عجیب لگ رہی تھی کہ میں نے غیر ارادی طور پر ایک بزرگ شخص سے یہ سوال پوچھا کہ تقسیم کے وقت کیا ہو گیا تھا؟ وہ واضح طور پر افسردہ ہو گیا اور ماضی میں کھو گیا۔ قاتل اور لٹیرے ''باہر'' سے آئے تھے، اس نے کہا۔

میرا آخری پڑاؤ میرے دوست بیدی خاندان کا محل تھا۔ اب وہ ایک سکول میں بدل چکا تھا۔ نوجوان ہیڈ ماسٹر نے اپنی اوپن ائر کلاس کو چھوڑ کر مجھے بڑی توجہ سے سب جگہیں دکھائیں۔ اس کے شاگرد، کم عمر طالب علموں کی طرح بڑے جوش و جذبے کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ میں اپنے آپ کو یاد کرا رہا تھا کہ یہ سرزمین میرے آباؤ اجداد کی سرزمین تھی۔ اور یہ گرم جوش لوگ میرے اپنے لوگ تھے اور تقریباً یقینی بات ہے کہ ان کے میرے ساتھ خونی رشتے بھی ہوں گے۔ ہمارے راستے اس وقت جدا ہوئے ہوں گے جب کچھ ہی عرصے پہلے ہم نے اپنے مذہب تبدیل کیے۔ جلد ہی الوداع کہنے کا وقت ہو گیا۔ میں نے ماسٹر کا بہت شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد جب میں گاؤں کے دوسری طرف کار میں بیٹھنے کے لئے پہنچا تو میں نے بزرگ آدمی کا بھی شکریہ ادا کیا۔ مجھے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے، بوڑھے شخص کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہم گلے ملے اور میں نے اسے خدا حافظ کہا۔

واپسی پر میں سن رہا تھا کہ خانیجو مجھ سے باتیں کر رہا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اچھا محسوس کروں۔ وہ پورا گھنٹہ یا اس سے کچھ زیادہ، جتنا وقت اسلام آباد میں میرے ہوٹل تک پہنچنے میں لگا، بڑی شائستگی سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتا رہا۔ مگر جو کچھ بھی اس نے کہا وہ میرے خیالات کی رو سے اوپر سے گزر رہا تھا۔ میرا دماغ وہ کچھ سن ہی نہیں سکا جو وہ کہہ رہا تھا۔ اسلام آباد میں میرے ہوٹل میں بھی سفر ختم ہونے کے بہت دیر تک میں خاموشی سے لیٹا بار بار اپنے آپ سے یہی سوال کر یا رہا، 1947 کے بلوائی کون ہیں اور کہاں ہیں؟

——— مونی چدھا

لہولہو زمینی قافلے

کموڈور بی کرشنا دانگ نیوی کی اس باوردی ٹیم میں شامل تھے جو پنجاب سے نقل مکانی کرنے والے خاندانوں کے قافلے لے کر جایا کرتی تھی۔

18 ستمبر 1947 کی شام کو میں نئی دہلی میں ایک دعوت میں موجود تھا، بمبئی میں اپنی ڈیوٹی سے چھٹی پر تھا۔ کیپٹن بی ایس سمان (جو بعد میں ایڈمرل اور نیوی چیف بنے) نے مجھے دیکھ لیا، فوراً مجھے گھیر لیا اور کہا ''تم چھٹی لے کر مزے کر رہے ہو جبکہ اتنا کچھ ہو رہا ہے''؟ ہم دوست تھے، اگرچہ میں ان سے جونیئر تھا۔ ''مجھے ایک آدمی کی ضرورت ہے جو کل لاہور جائے'' اگلے روز میں اپنی نیوی کی وردی پہنے انڈین آرمی کے ایک ڈکوٹا جہاز میں سوار لاہور میں والٹن پر اتر رہا تھا۔

لیفٹیننٹ پران پراشر اپنی فوجی موٹر سائیکل پر جہاز تک آئے، میرا بیگ اپنے جوان کو تھمایا، مجھے موٹر سائیکل پر اپنے ساتھ بٹھایا اور ایک گھنٹے کے اندر ہی

مجھے ایک خون کے پیاسے ہجوم میں سے گزار کر، جن کے ہاتھوں میں خون آلودہ برچھیاں تھیں، رائے ونڈ سٹیشن لے گیا۔ جہاں میں نے پہلی ٹرین دیکھی جس میں کوئی مسافر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ صرف سرخ خون دروازوں کے نیچے سے ٹپک رہا تھا جو ساری کہانی بتا رہا تھا۔ ہم بریگیڈیئر سٹیونز اور کرنل موبائٹ کے ملٹری ایویکوایشن ہیڈ کوائر میں یہ اطلاع پہنچانے کے لئے چلے۔ اس دن کے بعد سے ریلوے کے ذریعے تمام آمدورفت بند کر دی گئی اور ٹرکوں کے ذریعے اور پیدل قافلوں کی صورت میں آمدورفت شروع کی گئی۔

ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا تھا مگر یہ پہلے یومِ آزادی کا خاصہ تھا۔ بحریہ کے ایک فوجی کی حیثیت سے تجربے نے مجھے یہ ہمت دی کہ جو کچھ بھی سامنے آیا میں اسے برداشت کرتا گیا۔ ڈی اے وی کالج کیمپ میں پہلی مرتبہ جانا، جہاں ہندوستان جانے کے لئے مہاجر جمع تھے اور خون میں لت پت لاشوں سے بھرا ہوا تھیلا دیکھنا جن میں اکثر کی آنتیں باہر نکلی ہوئی تھیں اور تعفن کے بھبکے اٹھ رہے تھے، نے مجھے کافی سخت دل بنا دیا۔ نیوی میں تقریباً آدھے افسر اور سیلر پنجاب سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ سب کے سب چھٹی کے لئے درخواست کر رہے تھے تاکہ اپنے گاؤں یا شہر جا کر اپنے خاندان والوں کی مدد کر سکیں۔ اگر انہیں اپنے طور پر جانے پر اجازت دے دی جاتی تو مزید افراتفری مچ جاتی۔ چنانچہ نیول ہیڈکوارٹر نے یہ فیصلہ کیا کہ لاہور میں بھی نیوی کا دفتر قائم کر دیا جائے اور اس طرح نیوی زمینی قافلوں کا بندوبست کرنے کے لئے پہنچ گئی اور اس بڑے انقلاب میں حصہ لیا جس میں 43 لاکھ افراد پنجاب کی سرحد کے آر پار لے جائے گئے۔ جلد ہی ہم نے پنجاب کے ہر ضلع سے سڑک کے راستے سفر کرنے کے لئے چھوٹے چھوٹے قافلے ترتیب دیئے جن کی کمانڈ ایک نیوی لیفٹننٹ کے پاس ہوتی تھی اور اس کے ساتھ پانچ سے دس وردی پوش محافظ ہوتے تھے جو سٹین گنوں، رائفلوں اور بعض اوقات، راولپنڈی اور پٹیالہ جیسے زیادہ پر تشدد علاقوں میں، برین گنوں سے بھی مسلح ہوتے تھے۔ دوسری طرف کا ایک افسر یا پیٹی افسر مقامی لوگوں کے ساتھ رابطہ کے لئے ساتھ رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح کے ایک سفر پر میں سرگودھا گیا۔ یہ شہر بڑا پر امن تھا۔ یہاں ماسٹر لہنا سنگھ کی کوششوں سے مختلف مذاہب کے درمیان روایتی ہم آہنگی قائم

تھی ۔ یہ کشیدگی کے اس دور میں سیاسی قیادت کا بہترین مظاہرہ تھا۔ وہ بیوی کے لوگوں کے خاندانوں کا پتہ لگانے اوران کی مدد کرنے کے لئے پورے ضلعے میں میرے ساتھ ساتھ گئے ۔ گردآلود سڑک پر ہم اپنے چہرے پر گیلا رومال لپیٹ لیتے تاکہ ریت ہمارے اندر نہ جائے ۔

ایک مرتبہ مسلمان دیہاتیوں نے مجھے گاؤں کے باہر روک لیا اور ' کپتان صاحب ' کے لئے ایک بہترین خچر زین کس کر لایا گیا کیونکہ مجھے پیدل گاؤں آنے دینا گاؤں والوں کی بے عزتی تھی ۔ اس علاقے کے لوگوں میں فوجی افسروں کے لئے اسی طرح کا عزت اوراحترام پایا جاتا تھا۔

اس کے برعکس دریائے چناب پر جھنگ کا مہاجر کیمپ تھا، جہاں مجھے تقریباً ایک ہزار مہاجر دہشت زدہ حالت میں ملے ۔ بڑی احتیاط سے مجھے ایک کاغذ کا پرزہ دیا گیا جس پر شہر کا ایک پتہ درج تھا جہاں ایک خاکسار نے ایک نوجوان لڑکی کو اغوا کر کے رکھا ہوا تھا۔ جب ہم علاقے میں دوسری مرتبہ گئے تو ہم نے اس لڑکی کو چھڑالیا اور آخر کار وہ دہلی پہنچ گئی اور جب ہیڈ کوارٹر نے مجھے واپس بلایا تو وہ میری والدہ کے ساتھ رہ رہی تھی ۔ دسمبر میں ، بالکل معجزاتی طور پر اسے کناٹ پیلس میں اپنے انکل مل گئے ۔ پھر ایک روز وہ آئی تو دلہن کی طرح تیار تھی ، پتہ چلا کہ اس کی اچھی جگہ شادی ہوگئی ہے ۔ تاہم ، اس جیسی بہت کم لڑکیاں تھیں جن پر خدا اس طرح مہربان ہوا ہو۔

میرے لئے شائد سب سے تکلیف دہ وہ واقعہ تھا جو منٹگمری میں پیش آیا۔ پورا دن اس ضلع میں لوگوں کے انخلاء کا کام کرنے اور تمام مہاجروں کو جمع کر کے ایک مقامی کیمپ میں پہنچانے کے بعد میں اور لیفٹیننٹ ہریش بھگت اس کے ایک دوست کے ہاں کھانے پر چلے گئے ۔ رات کو تقریباً دس بجے جب ہم پیدل اپنے کوارٹر کی طرف آتے ہوئے اسٹیڈیم کے پاس سے گزرے تو ہمیں ایک چیخ نے چونکا دیا۔ ایک آدمی بلا وجہ گول گول گھوم رہا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ ایک بہاری مالی تھا اور اسے ابھی ابھی چھرا گھونپا گیا تھا۔ اس کی آنتیں باہر لٹک رہی تھیں ۔ ہریش اس کی امداد کے لئے کچھ لینے چلا گیا جبکہ

مجھے اس آدمی کو چپ کرانے اور اس کی آنتیں سنبھالنے کے لئے اس کے پاس رہنا پڑا۔ ایک ڈاکٹر کو پستول کی نوک پر بستر سے اٹھا کر لایا گیا اور پھر ہم ان دونوں کو مقامی ہسپتال پہنچا کر آئے اور اس بات کا اطمینان کر لیا کہ آپریشن شروع ہو جائے۔ پھر ہم باہر آئے اور سارا کھانا اور باقی کچھ بھی لاان میں تے کر دیا۔ خدا کرے وہ مالی زندہ بچ گیا ہو۔

ایک اور تجربہ سیالکوٹ کے قافلے کے ساتھ ہوا جہاں ایک شام نارووال تحصیل سے مہاجروں کو لا کر میں نے سیالکوٹ کے ایک کیمپ میں چھوڑ دیا۔ یہاں ایک نوجوان نے مجھے کہا کہ میں اس گاؤں جاؤں جو صرف دس میل کے فاصلے پر ہے کیونکہ جو "غیر مسلم وہاں باقی بچ گئے ہیں وہ صبح تک زندہ نہیں بچیں گے"۔ شام کے گہرے ہوتے سایوں میں جب ہم کوٹلی لوہاراں پہنچے تو ہمارے سامنے مقامی لوگوں کا ایک پرغیض ہجوم تھا۔ ہم نے اس گاؤں سے، جو مغل دور کے تیراندازوں کا گاؤں تھا اور یہاں لوگ پوری طرح مسلح تھے، پچاس کے قریب مہاجروں کو نکال لیا۔ پاکستان نیوی کے افسران ہماری مدد کر رہے تھے۔ یہاں ہمیں پتہ چلا کہ دشمنی کی وجہ اصل میں یہ تھی کہ وہ آدمی جو ہمیں یہاں لایا تھا ایک سنار کا بیٹا تھا، اس کے پاس لوگوں کے زیورات مرمت کیلئے موجود تھے اور وہ ہماری حفاظت میں یہ زیورات اپنے ساتھ لے کر غائب ہو جانا چاہتا تھا۔ مجھے تمام دعویداروں کو فوری انصاف مہیا کرنا پڑا اور اس طرح جوابی فائرنگ میں ہلاکتوں کا ایک واقعہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

اس زمانے میں میں نے نیوی کٹ داڑھی بھی رکھ لی جس سے مجھے دیہاتیوں کے ساتھ کام میں بڑی مدد ملی۔ مجھے یاد ہے کہ جب راولپنڈی میں محافظوں اور ڈرائیور کو بیرک میں چھوڑنے کے بعد میں نے اپنے لئے مناسب رہائش تلاش کرنے کی کوشش کی تو میں سیدھا چکلالہ کنٹونمنٹ میں اے ایس سنٹر میس میں چلا گیا۔ میں نے میس کے حوالدار کو بتایا کہ مجھے ایک رات کے لئے یہاں ٹھہرنا ہے اور اس نے میرے لئے مہمانوں کے بہترین کمرے میں بستر وغیرہ لگا دیا۔ صبح کی چائے مجھے میس کے صدر، جو کرنل تھے، کی طرف سے دعوت تھی۔ ان کے ساتھ میں نے چھوٹا حاضری میں شرکت کی اور دوستانہ

گپ شپ کے بعد ان کا شکریہ ادا کیا اور مری کی طرف روانہ ہو گیا۔ کسی نے ایک مرتبہ بھی مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں پاکستانی ہوں یا انڈین۔ مسلمان ہوں یا کچھ اور۔ اس زمانے میں افواج کے افسران کے درمیان اس طرح کے برادرانہ روابط تھے اور اس کی وجہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران اکھٹے ہونا بھی تھا۔

——— بی کرشنا دانگ

تقسیم کے دکھ ابھی ختم نہیں ہوئے

تقسیم کے دنوں کو یاد کرتے ہوئے زیادہ تر لوگ کہتے ہیں کہ انہیں وہ دکھ اور اذیت آج بھی محسوس ہوتی ہے۔ انہیں تاریخ میں ہمیشہ مہاجر ہی کہا جائے گا۔

آخر کار آزادی مل گئی۔ مگر یہ اپنے ساتھ خوشیاں بھی لائی اور غم بھی۔ تقریباً 35 کروڑ لوگوں نے برطانیہ کی ڈیڑھ سو سالہ غلامی کا جواء اتار پھینکا۔ مگر اس آزادی کی قیمت سرحدوں کے دونوں طرف لاکھوں لوگوں نے اپنے لہو سے ادا کی۔ انہوں نے اپنی جان اور اپنے تمام مال واسباب کی قربانی دی۔ کیا ہم اس تقسیم کی وجہ صرف دونوں گروہوں کے مذہبی اختلافات کو قرار دے سکتے ہیں؟ جناب دیوراج سردانہ جو تقسیم کے چشم دید گواہوں میں سے ایک ہیں اپنے شہر منٹگمری کے بارے میں کہتے ہیں ''اگرچہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مذہبی اختلافات موجود تھے مگر دونوں مذاہب کے عام لوگ امن و امان سے رہتے تھے اور باہمی رابطے رکھتے تھے۔''

شاہدرہ کے رہنے والے کرتار سنگھ، تقسیم کے وقت 19 برس کے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ''راولپنڈی میں ہندو اور مسلمان بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔ یہ انگریز تھے جنہوں نے ان کے درمیان اختلافات پیدا کیے۔ وہی اس مذہبی تکون کا سب سے مضبوط بازو تھے''۔ یہ بات 1857 کی جنگ کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد و بھائی چارے کو دیکھتے ہوئے سچ دکھائی دیتی ہے اور اس کے بعد ہی انگریزوں نے ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی اپنائی۔ بمبئی کے گورنر جان الفنسٹن

(1856-60) نے کہا تھا ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو ایک قدیم رومن مقولہ ہے اور ہمیں بھی اس کو اپنانا چاہیے''۔

سچد یوا، ایک ریٹائرڈ سرکاری افسر، جنہیں راولپنڈی میں اپنے گھر سے بے گھر ہونا پڑا، کہتے ہیں کہ ''انگریز حکمرانوں نے نئے ابھرتے ہوئے طبقات میں اپنے دوست بنانے اور مختلف گروہوں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرنے کی پالیسی اپنا رکھی تھی''۔ کپور جواب ایک بزنس مین ہیں کہتے ہیں ''ہم مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ مستحکم تھے کیونکہ مسلمانوں نے اصلاحات کو دیر سے قبول کیا۔ اس طرح پیچھے رہ جانے سے مسلمانوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوا جس کے تحت انہوں نے مذہب اور روایات میں پناہ لی''۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والی رومیلا، ہر مکھیس اور بپن چندرا ہندوستان کے مذہبی نکتہ نظر کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کے قدیم دور کو ہندو دور اور وسطی دور کو مسلم دور کہنے والے مذہبی انداز فکر کو تقویت ملی۔

اہوجا، ایک ریٹائرڈ سرکاری ملازم جنہیں مجبوراً اپنی جائیداد چھوڑ کر لاہور سے جانا پڑا، کہتے ہیں ''میں اس وقت صرف بارہ سال کا تھا، لیکن سکھوں کو زبردستی ملا بنانے اور لڑکیوں کو اٹھا لے جانے کے

خوفناک واقعات آج بھی میری یاداشت میں تازہ ہیں۔ مسلمان اس سے پہلے بھی ایسے نہ تھے۔ ہمارے لیڈروں نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے ان کے جذبات کو مشتعل کیا''۔

ان میں سے بعض لیڈر ہندو مسلم اتحاد پر یقین رکھتے تھے۔ تاہم، اپنی تحریروں اور تقریروں میں انہوں نے ایسی زبان اختیار کی جس کا منبع ہندو روایت تھی۔ تلک کی طرف سے شیواجی اور مہارانا پرتاب کو قومی ہیرو قرار دیا جانا اور گاندھی جی کا رام راج کا نعرہ، اگر چہ عوام کو متوجہ کرنے کے لئے تھا، مگر اس سے مسلمانوں پر ناگوار اثرات مرتب ہوئے۔ اسی طرح مسلمانوں کی مذہبی اصلاحی تحریکیں، دار السلام قائم کرنے کے لئے وہابی تحریک کی غیر مسلموں کے خلاف جدوجہد اور ہندوؤں کی آریہ سماج کی شدھی اور آریائی احیاء کی تحریکوں نے مذہبی اختلافات کی آگ کو بھڑکایا۔

سہانے کے ماں باپ دونوں اس جدوجہد میں مارے گئے۔ ہماری غربت سے انگریزوں نے بڑی اچھی طرح فائدہ اٹھایا۔ کیونکہ وہ سب سے بڑے ملازمت مہیا کرنے والے تھے تمام تعلیم یافتہ نوجوان ملازمت کے لئے ان کی ہی طرف دیکھتے تھے۔ مسز سکھو سنگھ، جن کے نانا اور نانی دونوں تقسیم کے دوران مارے گئے کہتی ہیں''ایک مسلمان خاندان نے چوری چھپے مجھے بچایا اور پناہ دی۔ اس کے بعد انہوں نے میری مدد کی اور مجھے ہوائی جہاز کے ذریعے انڈیا بھجوایا کیونکہ ٹرینوں پر مسلسل حملے ہو رہے تھے۔''

وہ تمام لوگ جو اس تقسیم کے متاثر ہیں آج بھی وہی دکھ محسوس کرتے ہیں۔ سردانہ نے کہا''ہم نے کبھی ایسی تقسیم نہیں دیکھی جس کے ساتھ ہی آبادی کا تبادلہ بھی ہوا ہو۔ رہنماؤں میں سے کسی نے اس دکھ کو محسوس نہیں کیا جو ایک انسان کو اپنی جائے پیدائش چھوڑنے سے پہنچتا ہے۔ ہماری محنت سے کمائی ہوئی ساری رقم کھوگئی۔ پچاس برس گزرنے کے بعد بھی ہم اس دہشت سے نہیں نکل سکے۔ ہمیں ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ مہاجر کہا جائے گا۔''

وعدں کی سرزمین تک سفر

پچاس برس گزر جانے پر بھی تقسیم کے خونریز دن آج بھی ان لوگوں کی یادوں میں تازہ ہیں جو اس سن متاثر ہوئے۔ اگرچہ اب وہ اپنی مرضی کے مما لک میں آرام سے رہ رہے ہیں مگر آج بھی وہ ان دنوں کی کہانیاں سناتے ہیں جب برصغیر نے خون کے دریا سے گزر کر نئی شکل پائی۔ یہ قتل اور لوٹ مار کی کہانیاں ہیں، قاتلانہ حملوں کی اور بہادری سے بچائے جانے کی داستانیں ہیں، دشمنی کی کہانیاں ہیں اور دوستی کے بھی۔ اور ہر سال اگست میں یہ تمام یادیں ایک مرتبہ پھر بھرپور انداز میں تازہ ہو جاتی ہیں۔

چوہدری غلام حسین مشرقی پنجاب میں اپنے آبائی گاؤں سے بچ نکلنے کا واقعہ یاد کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا ''ہم ڈھلوں میں رہتے تھے۔ ہمارے گاؤں چھوڑ کر نکلنے کا فیصلہ کرنے سے پہلے میرے سکول کے ہندو ساتھی کئی مسلمان خاندانوں کو قتل کر چکے تھے''۔ پورے گاؤں میں ایک ہی ریڈیو تھا جس پر حسین کے دادا نے نئے ملک کے قیام کی خبر سنی۔ اس ملک کا نام پاکستان تھا، پاک لوگوں کی سرزمین۔ جسے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے خاص طور پر ہندوستان سے الگ کر کے قائم کیا گیا تھا۔ جب کہ ہر طرف تشدد جاری تھا، ان کے لئے پاکستان امید کا نشان تھا اور انہوں نے اپنے خاندان کو ان درجنوں لوگوں کے ساتھ امیدوں کی اس سرزمین کی جانب چلنے پر آمادہ کر لیا۔ حسین کہتے ہیں۔ ''ہم سب ایک میدان میں اکٹھے ہوئے جسے گڈانہ کہتے تھے۔ یہ ایک بہت بڑا میدان تھا جو لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان سب سے اپنا اپنا سامان سروں پر اٹھا رکھا تھا۔ مردوں نے بھاری سامان اٹھایا ہوا تھا جبکہ عورتوں نے بچوں کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ یہ انسانوں کے سروں کا ایک سمندر تھا۔''

حسین کی عمر اس وقت صرف بارہ سال تھی۔ انہیں یاد ہے کہ کچھ مسلح لوگ جن میں فوج کے مسلمان سپاہی بھی تھے، ان مہاجرین کی حفاظت کر رہے تھے۔ انہوں نے سارا سفر پیدل کیا۔ کچھ لوگوں کے پاس بیل گاڑیاں یا گھوڑے تھے، مگر زیادہ تر لوگوں کو یہ طویل سفر پیدل ہی طے کرنا تھا۔ وہ چلتے رہے، اس تشدد اور قتل و غارت سے بچنے کے لئے جس کا ان میں سے اکثر سامنا کر چکے تھے۔

راستے میں حسین کے قافلے پر سکھوں نے حملہ کر دیا۔ ان کے خاندان والوں نے ایک بیل گاڑی کے نیچے چھپ کر اپنی جانیں بچائیں۔ حسین کو آج بھی حملے کے بعد ہر طرف پھیلی ہوئی لاشوں کا منظر یاد ہے۔ یہ ان کی زندگی کا سب سے تکلیف دہ منظر تھا۔ مگر ابھی تو بہت کچھ اور بھی دیکھنا تھا۔

تھکا ہوا اور زخم خوردہ قافلہ آخر کار پاکستان پہنچ گیا۔ مگر بدقسمتی سے حسین کیلئے یہ سفر ختم نہیں ہوا۔ پاکستان آنے کے کچھ عرصے کے بعد ہی ان کے دادا اور والدہ وفات پا گئے۔ بارہ سال کی عمر میں اب وہ اپنے خاندان میں اکیلے مرد تھے۔ انہیں والٹن مہاجر کیمپ لے جایا گیا۔ ہر کوئی اپنی پریشانیوں میں

اس قدر رڈوبا ہوا تھا کہ کسی اور کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ حسین یاد کرتے ہیں کہ ایک رات وہ پانی لینے کے لئے ایک کنوئیں پر گئے وہ کنواں خون سے بھرا ہوا تھا۔ وہ بے ہوش ہو گئے۔ "جب بھی کبھی ہم اپنے کیمپ سے باہر نکلے ہم نے سکھوں کی لاشوں دیکھیں" حسین کہتے ہیں۔ یقیناً یہ وہ سب کچھ ایسا نہیں تھا جس کی انہیں تمنا تھی۔ دہشت زدہ نوجوان اپنے خاندانوں کو لے کر فیصل آباد کے نزدیک ایک گاؤں میں چلا گیا جہاں اسے مزدور کی حیثیت سے کام مل گیا۔ مگر کچھ ہی دنوں بعد مزید خون خرابہ شروع ہو گیا۔

ایک روز وہ چند مقامی لڑکوں کے ساتھ ایک کھیت سے گزر رہے تھے کہ انہیں ایک ہندو لڑکی نظر آئی۔ وہ یاد کرتے ہیں "اس نے ہماری منتیں کیں کہ اسے قتل نہ کریں، یہاں تک کہ اس نے اپنی جان بچانے کی خاطر اپنا جسم بھی ہمیں پیش کرنے کی کوشش کی" وہ یاد کرتے ہیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے بہت کہا کہ اسے زندہ چھوڑ دیں مگر انہوں نے درانتی سے اس کا گلا کاٹ دیا۔ اس کے بعد حسین کو کبھی پاکستان پاک لوگوں کی سرزمین نہیں لگا۔ مگر صرف یہی ایک خواب نہیں تھا جو چکنا چور ہوا۔

"میں یہاں اس لیے نہیں آیا تھا کہ زمین کے ایک ٹکڑے کے کلیم کے لئے مجھ سے سرکاری اہلکار 2000 روپے طلب کریں۔ ایک اور مہاجر مقبول جلیس نے کہا۔ بہت سے اور لوگ بھی ایسے واقعات سناتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے جھوٹے پراپرٹی کلیموں کے ذریعے یا بے ایمانی کے دوسرے طریقوں سے خوب دولت کمائی۔ "میں اس سرزمین پر اس لئے نہیں آیا تھا کہ مجھے اپنے راشن کے لئے اپنی بہن کا سونے کا ہار دینا پڑے"، کراچی میں رہنے والے ایک ریٹائرڈ انجینئر حسین نے کہا۔

کئی اور طرح کی بدعنوانی کے بارے میں بھی سننے میں آتا ہے۔ "ایک عورت اور اس کی چار بیٹیوں کو بمبئی میں ایک ہندو نے بچایا"۔ 64 سالہ رضیہ سلطانہ نے کہا جو اب اپنے بیٹے کے ساتھ گلشن اقبال میں رہتی ہیں۔ "جب وہ عورت پاکستان پہنچی تو بیمار تھی، اس نے اپنی بیٹیاں ایک دوسری عورت کے حوالے کر دیں۔

اس عورت نے ان لڑکیوں کو جسم فروشی کرنے پر مجبور کر دیا اور خوب پیسہ بنایا، حالانکہ وہ مسلمان تھی۔"
پنجاب کے برعکس جہاں تشدد، کرپشن اور دھوکہ اتنا ہی تھا جتنا مہاجر اپنے پیچھے چھوڑ آئے تھے، سندھ میں مہاجروں کو خاصی گرم جوشی کے ساتھ جگہ دی گئی۔ وہ تمام لوگ جو سندھ سے آئے بتاتے ہیں کہ انہیں سندھ کی مقامی قیادت نے خوش آمدید کہا۔ سندھ مسلم لیگ کا مضبوط گڑھ تھا اور یہاں دو خاندان زیادہ بااثر تھے، ہارون اور قاضی۔ یہ دونوں خاندان اور باقی لیڈر بھی جن میں جی ایم سید بھی شامل تھے، مہاجروں کو پر جوش انداز میں خوش آمدید کہنے کے حامی تھے۔
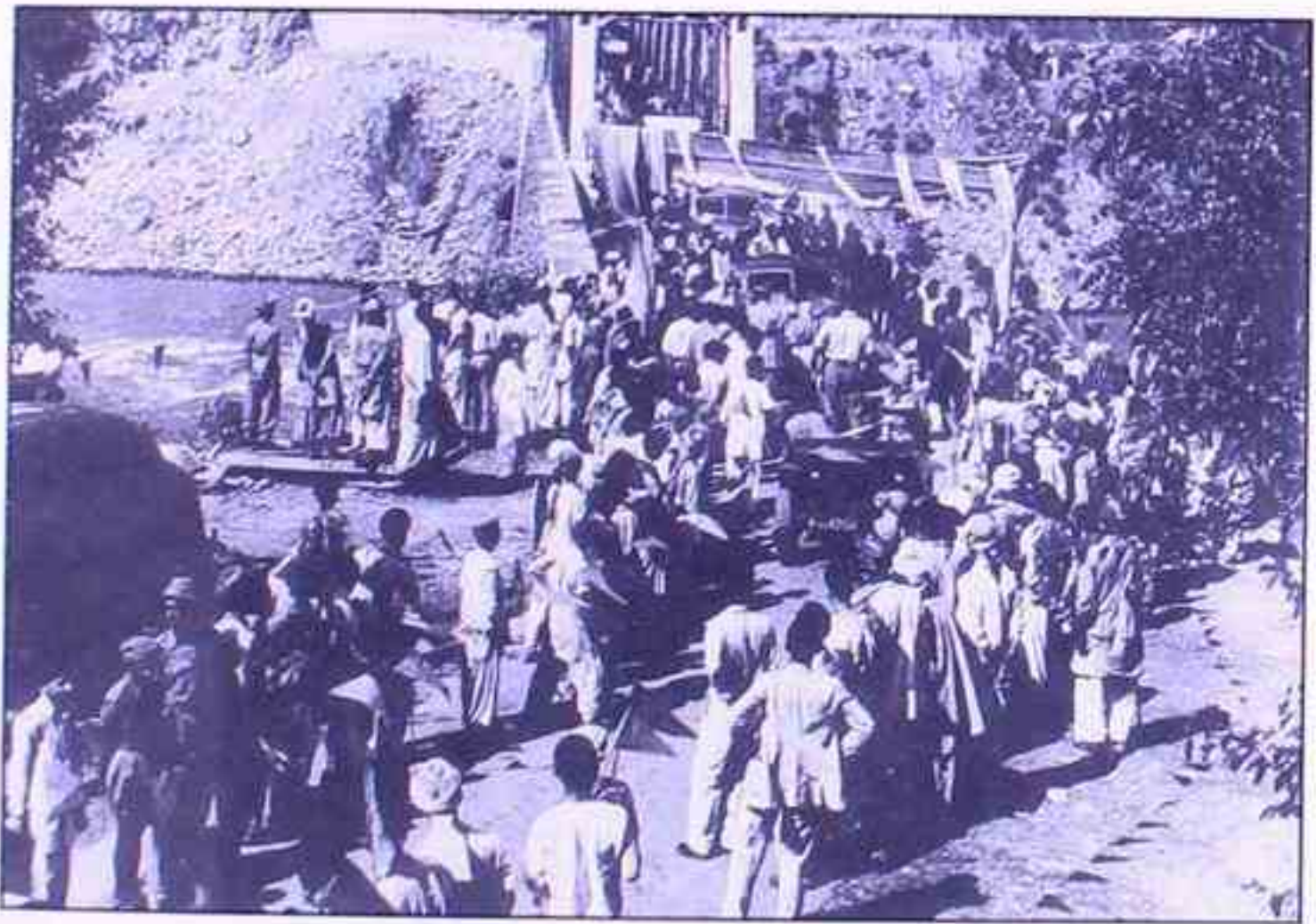
مہاجروں اور مقامی لوگوں کے درمیان آشتی کے حق میں دیواروں پر پوسٹر لگائے گئے۔ ان میں سے بعض میں اچکن پہنے شخص کو ایک سندھی لباس میں ملبوس شخص کے ساتھ دکھایا گیا تھا۔ سندھ میں جس کسی کو بھی تقسیم کا زمانہ یاد ہے، موبو شیدی کو نہیں بھول سکتا۔ موبو شیدی نے، جو سرکاری ملازمت سے ریٹائرڈ ہو چکے ہیں، پھلیلی کے علاقے میں بہت سے مکانات جو سندھی ہندو شرنارتھی چھوڑ کر گئے تھے،

مہاجروں کو دلوائے۔ ہر لحاظ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سندھ میں مہاجروں کے لئے اگر کوئی جذبہ تھا تو وہ ہمدردی کا جذبہ تھا۔ تاہم کئی لوگ ایسے بھی تھے جو ہمدردی کا اظہار اپنے گھٹیا مقاصد کے لئے کر رہے تھے۔ "سندھ کے بعض وڈیروں نے پاکستان کی حمایت اس لئے کی کہ ان کی زمینیں ہندوؤں کے پاس رہن تھیں"۔ مصنف عبدالقادر جونیجو کہتے ہیں "ان کے نزدیک پاکستان کا مطلب اپنی زمینیں واپس حاصل کرنا اور ہندوؤں سے نجات پانا تھا" مگر اس صورت میں بھی مہاجروں سے ہمدردی کا مطلب ہندوؤں سے نفرت نہیں۔

سندھ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی روایات اور طرز زندگی ایک ہی ہے۔ جونیجو کہتے ہیں وہ دونوں قلندر اور بھٹائی کے مزاروں پر جاتے ہیں۔ آج بھی یہ انداز کافی ملتا جلتا ہے۔ میری اپنی شادی بھی ہندوانہ انداز میں ہوئی تھی، جس میں میں نے اپنی دلہن کے ساتھ سات چکر بھی لگائے تھے۔

اس فراخدلانہ رویے کی وجہ سے آنے والے مسلمانوں اور جانے والے ہندوؤں دونوں کو کئی سال تک امن وامان حاصل رہا۔ تاہم سندھ نے بھی تقسیم کے دنوں کے تشدد کا کچھ نہ کچھ حصہ دیکھا، اگرچہ یہ پنجاب کے مقابلے میں بہت کم تھا۔ کراچی کے کمیونسٹ لیڈر سوبو گیانچندانی بتاتے ہیں "ایک بار میرا سامنا ایک ہجوم سے ہوا جس نے ایک بس کو روک رکھا تھا۔ ان لوگوں نے اس میں سوار سکھ لڑکے کو کھینچ کر نیچے اتارا اور ذبح کر ڈالا۔ مگر اس سے پہلے کہ یہی کچھ میرے ساتھ ہوتا کسی نے مجھے وہاں سے نکال لیا۔ یہ وزیر خان تھا، ریلوے کا ایک ملازم۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں نے دہلی میں یہ قتل وغارت دیکھا ہے اور مجھے معلوم ہے یہ کس قدر ہولناک بات ہے۔ وہ مجھے بچا کر اپنے گھر لے گیا۔ اسی لئے جنوری 1948 کے فسادات کے دنوں میں گیانچندانی کے پڑوسی ان مسلمانوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے جو اپنے ہندو کامریڈ سے ملنے آتے تھے۔ پھر بھی مسلمانوں نے ہی اس عمارت کو بلوائیوں سے بچایا جس میں زیادہ تر ہندو آباد تھے اور گیانچندانی بھی وہیں رہتے تھے۔ مگر اچھے لوگوں کی یہ کہانیاں تقسیم کی خوف وتشدد کی لہر میں بہت ہی خال خال نظر آتی ہیں۔ دہلی اور بمبئی جیسے فساد زدہ

علاقوں سے ملنے والی خبریں ہمیشہ نسبتاً پرسکون علاقوں کے لوگوں کو پریشان کر دیتی تھیں، جہاں تقسیم سے پہلے مختلف مذاہب کے لوگ کئی صدیوں سے مل جل کر رہتے چلے آ رہے تھے۔ ایسی فضا بن گئی تھی کہ وہ لوگ جو فسادات سے براہ راست متاثر نہیں بھی ہوئے تھے وہ معاشی امتیاز سے بچنے کے لئے بعد میں نقل وطن کر گئے۔

مجھے پاکستان آنے پر کوئی پچھتاوا نہیں ہے مسیح الرحمٰن کہتے ہیں کم از کم میرے بچوں نے یہاں تعلیم تو حاصل کر لی۔ ہندوستان میں یہ ممکن نہیں تھا۔ 68 سالہ مسیح الرحمٰن پچیس برس تک پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن میں ملازمت کرنے کے بعد اب کراچی کی پاک کالونی میں ایک دکان چلاتے ہیں۔

ایک مہاجر، جلیس کہتے ہیں ہمیں فخر ہے کہ ہماری شناخت ہے، اگر ہم ہندوستان میں رہتے تو ہماری اپنی کوئی شناخت نہ ہوتی مگر ان مہاجروں نے اس کی جو قیمت چکائی ہے وہ ہرگز معمولی نہیں ہے۔ ان میں سے بہت سوں کے رشتہ دار دوسرے ملک میں رہ گئے اور کسی نہ کسی وجہ سے ان کے ساتھ نہ آ سکے۔ اگر ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ اپنے خاندانوں کی تقسیم کی کبھی اجازت نہ دیتے۔ مگر ان کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔

ایک اور شخص قدوس نے کہا، صرف یہ بات نہیں کہ وہ ایک دوسرے ملک میں رہ رہے ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنے خاندان کے ان لوگوں کو جب اور جس طرح چاہیں مل نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ہندوستان میں رہنے والی اپنی کزن سے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری بیوی بھی اس کرب سے گزرے جو میری خالہ اٹھا رہی ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان تقسیم کے چند سال بعد ہی سرحدوں کو بند کر کے جو آہنی پردہ کھڑا کر دیا گیا وہ مستقل قائم ہے۔

" کوئی بیس برس پہلے جب میرے بڑے بھائی فوت ہوئے تو ہم نے کوشش کی کہ ہماری بہن، آمنہ

(اماں) کانپور سے جنازے میں شرکت کے لئے آ جائیں مگر انہیں ویزہ نہیں ملا"۔کورنگی کراچی میں رہنے والی رقیہ نے بتایا۔" پھر جب ہمارے چھوٹے بھائی فوت ہوئے تو ہم نے پھر انہیں بلانے کی کوشش کی اور بھائی کی میت سردخانے میں رکھوادی کہ شائدوہ آخری رسومات میں شرکت کے لئے پہنچ سکیں مگراس بار بھی وہ نہ آسکیں۔"

سعیدہ خاتون جواپنے خاندان میں اگن بی کے نام سے جانی جاتی ہیں اسی طرح کے ایک مثال ہیں۔ انہوں نے کہا"میں نے اپنے بھائی کو گزشتہ پچاس برس سے نہیں دیکھا" اگن بی کی عمراسی برس سے زیادہ ہےاوروہ لانڈھی میں رہتی ہیں۔ میں اپنے بھتیجے بھتیجیوں کی شادیوں میں شریک نہیں ہوسکی۔اب میں اپنے پوتے پوتیوں کوملنا چاہتی ہوں اورانہیں کہانیاں سنانا چاہتی ہوں

حال ہی میں انڈیااور پاکستان کے درمیان ویزہ کی پابندیاں نرم کرنے کے بارے میں جو مذاکرات ہوئے ہیں ان سے ایسے خاندانوں کی امید بندھی ہے۔" خدا کرے دونوں حکومتیں کوئی بہتر اقدامات کرسکیں"۔عمرکوٹ کے رہنے والے لال چند نے کہا۔" اس سے مجھےاور سرحد پار رہنے والے میرے رشتہ داروں کو بے حد خوشی ہوگی"۔

تقسیم کی سب سے تکلیف دہ باقیات کھو جانے والے رشتہ داروں کی یاد ہے۔ جمیلہ کی اماں کا، جو لاڑکانہ میں ایک گھریلوملازمہ بن گئی، اپنا بھی یقیناً کوئی نام رکھا گیا ہوگا جب وہ پیدا ہوئی تھی۔مگر جب پاکستان آنے کے خونریز سفر میں اس کی بیٹی جمیلہ کھوگئی تواس نے اپنانام جمیلہ کی اماں رکھ لیا تا کہ جب بھی کوئی اسے آواز دے،اسے اپنی زندگی کامشن یادآ جائے کہ اسے اپنی بیٹی کوتلاش کرنا ہے۔ جب بھی کبھی اسے پتا چلتا کہ کوئی جمیلہ کہیں پرملی ہے تووہ اسے دیکھنے جاتی،مگر ہر بار مایوس لوٹ آتی۔

زیادہ تر مہاجروں کے لئے پاکستان ایک نئی دنیا تھا۔ جولوگ مشرقی پنجاب سے آئے تھے وہ تواس میں

آسانی سے گھل مل گئے اور پنجاب کے شہروں اور دیہاتوں میں بس گئے مگر ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے آنے والوں کے لئے یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔ راجپوت اور ہنکی جو پنجابی بولنا نہیں جانتے تھے، انہیں اپنے نئے وطن میں پوری طرح بسنے میں پوری ایک نسل کا عرصہ لگا۔

"ہمارے بزرگوں کو، جو اس علاقے سے تھے جسے اب ہریانہ کہتے ہیں، ہر قسم کے طنز برداشت کرنے پڑے"۔ محمد اسلم خان کہتے ہیں جن کے والد پنجابی نہیں تھے مگر انہوں نے پنجاب میں آباد ہونے کا فیصلہ کیا" مگر اب ہم گھل مل گئے ہیں، ہم نے رکاوٹوں کو توڑ ڈالا ہے" ان کی دادی رفیقہ خاتون بات کاٹ کر کہتی ہیں" اب بھی ہمارے اپنے رسوم ورواج ہیں، مثلاً شادیوں کے سلسلے ہیں"۔

"نقلِ وطن آزدی کا ایک افسوسناک باب ہے"۔ ملک کے پہلے دارالحکومت کراچی کے سابق ایڈمنسٹریٹر اور چیف کمشنر سید ہاشم رضا نے کہا۔ ہاشم رضا ان افسروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے کراچی میں مہاجرین کی بحالی کے لئے کام کیا۔ اب ان کی عمر 87 سال ہے۔

"ہم نے مہاجرین کو ٹھہرانے کیلئے 32 کیمپ قائم کئے۔ رضا صاحب نے بتایا۔ ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے مکانات اور عبادت گاہوں اور کچھ سکولوں کو کیمپ بنا دیا گیا۔ نئی مملکت کی بے بس حکومت جو کچھ بھی حاصل کر سکی وہ مہاجرین کو پیش کر دیا گیا۔ ہر سوموار کو قائداعظم مجھے بلاتے اور بحالی وآبادکاری کے کام کے بارے میں پوچھتے۔ اس کے کافی عرصہ بعد ناظم آباد، نیو کراچی اور لیاقت آباد جیسی آبادیوں میں مہاجرین آباد ہوئے۔ بدقسمتی سے جس خوشدلی سے سندھ نے مہاجروں کو خوش آمدید کہا تھا وہ زیادہ دیر قائم نہ رہی۔ 1960 کی دہائی کے اواخر تک، مہاجروں اور مقامی لوگوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہونا شروع ہوگئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ معاشی بدانتظامی نے اس بھائی چارے کے جذبے کو ختم کر دیا جو تقسیم کے دنوں میں پیدا ہوا تھا۔

"انہوں نے کبھی ہمیں قبول نہیں کیا"، رضی الحسن کہتے ہیں۔" یہ لوگ ہمیں قابضین کہتے ہیں۔ ہم نے

اپنی جانیں اس لئے نہیں قربان کی تھیں کہ ہمارے حقوق دبے رہیں" ۔ دوسری طرف کے دلائل بھی بڑے تلخ تھے ۔ مقامی لوگوں کا خیال تھا کہ مہاجر لوگ کبھی بھی اپنی سماجی برتری کے احساس کو مٹا نہیں سکے زیادہ تر مہاجر اس سرزمین اور معاشرے کو یاد کرتے رہتے ہیں جسے وہ چھوڑ کر آئے تھے اور مقامی لوگ اس کو اپنی توہین سمجھتے ہیں ۔

بہت سے لوگ حکمرانوں کو الزام دیتے ہیں کہا انہوں نے کشیدگی کو ہوا دی ۔" ہمارے حکمران عوام کے ساتھ مخلص نہیں ہیں " رحمان نے کہا" ہندوستان کے حکمران اس کے مقابلے میں زیادہ مخلص ہیں" ۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ ہندوستان کو اس لئے یاد کرتے ہیں کہ وہ ان کی جائے پیدائش ہے ۔" تقسیم ایک ٹھوس حقیقت ہے، اسے بدلا نہیں جاسکتا، انہوں نے کہا۔ مگر کم از کم دونوں ممالک اچھے تعلقات تو رکھ سکتے ہیں" ۔ انہوں نے ایک لمحے کو رک کر سوچا اور پھر کہا،" مگر ہندو مسلم تفرقہ تو ہندوستان میں اب بھی موجود ہے" ۔

" یہ سیاستدان ہمارے دلوں پر حکومت نہیں کرتے" ، 65 سالہ محمد منور نے کہا جو کراچی کی موسیٰ کالونی میں رہتے ہیں اور پیشے کے اعتبار سے جیولر ہیں ۔ میں نے اپنے خاندان کے لوگوں کو ہندو مسلم فسادات میں مرتے دیکھا، میں نے عورتوں کو خون میں لت پت لاشوں پر روتے دیکھا، یہ ایک ایسا ڈراؤنا خواب ہے جو بار بار سامنے آجاتا ہے ۔ اب دونوں ملکوں کے درمیان خوشگوار سفر بھی ہونے چاہئیں ۔ 1947 کی طرح نہیں جب ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے پاس لے جانے کیلئے صرف خونریزی کے قصے تھے ۔

—— اویس توحید

آزادی کا دن دیکھنے کے لئے ہم نے کیا کچھ کھویا

"آزادی کے ساتھ ہی آنسو، دکھ، مایوسی اور پریشانی بھی ملی۔

13 ستمبر 1947 کو، میں ہندوستان اور پاکستان کی بین الاقوامی سرحد پر انخلاء کے لئے ڈیوٹی پر مامور تھا۔ قافلے میں سویلین ٹرک تھے جن کے ساتھ فوجی محافظ تھے۔ میں دس باوردی سپاہیوں کے دستے کی کمانڈ کر رہا تھا۔ ہماری منزل نکودر میہت پور مہاجر کیمپ تھی۔

جب ہم لاہور سے روانہ ہوئے تو قافلے کے ٹرک غیر مسلم مہاجروں سے بھرے ہوئے تھے جنہیں امرتسر جانا تھا۔ جب ہم چلے تو ہمیں لاہور ویران اور اداس دکھائی دیا۔ رہائشی علاقوں کے مکانات سے دھواں اٹھ رہا تھا جو ماحول کو اور بھی اداس اور غمگین بنا رہا تھا۔

جب ہم شہر کے مضافات سے باہر پہنچے تو ایک طرف لاشیں بکھری پڑی تھیں اور دوسری طرف پھٹے پرانے چیتھڑوں میں ملبوس، بھوکے، معذور اور وحشی نما انسان تھے۔ جب ہم ذرا آگے بڑھے تو سڑک کے دونوں طرف میلوں تک لاشوں کے ڈھیر تھے۔ ان کی آخری رسومات کی ادائیگی کا وقت کسی کے پاس نہیں تھا کیونکہ ہیضے کی وبا سے ہر خاندان میں ذرا ذرا وقفے سے اموات ہو رہی تھیں۔ پیارے مرنے والوں کو، آہ وزاری کے بغیر ہی بڑی بے دردی سے سڑک کے کنارے ڈال کر چھوڑ دیا جاتا تھا کیونکہ مہاجروں پر مسلح سکھوں کے ظالمانہ حملوں نے انہیں ان سب جذبات سے محروم کر دیا تھا۔ یہ گروہ قافلوں پر حملے کر رہے تھے، جوان لڑکیوں کو اغوا کر رہے تھے، لوگوں کی بچی کھچی پونجی لوٹ رہے تھے اور بوڑھوں بچوں سب کا بے دریغ قتل عام کر رہے تھے۔

ہم شام کے وقت امرتسر پہنچے اور کمپنی باغ میں رکے۔ یہاں پر مہاجروں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ باغ جو کبھی ایک سرسبز تفریح گاہ تھا ایک چٹیل میدان میں بدل چکا تھا۔ مقامی حکام نے ہمیں آگے سفر کرنے کی اجازت نہ دی کیونکہ رات ہو چکی تھی اور قافلے میں سکھ مہاجروں کو سوار کیا جانا تھا جن کو راستے میں اتارتے جانا تھا۔

رات بھر ٹرکوں میں جگہ پانے کے لئے کوششیں ہوتی رہیں۔ ہم صبح تقریباً سات بجے چلنے کے لئے تیار ہوئے اور آہستہ آہستہ ہجوم میں سے راستہ بناتے ہوئے روانہ ہوئے۔ جہاں تک نظر جاتی تھی لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑی تھیں، ان کی بدبو سے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ اوپر آسمان پر بے شمار پرندے منڈلا رہے تھے جو مردہ لوگوں کا گوشت کھانے کو جمع ہو گئے تھے۔ اس منظر میں ہم نے اپنا سفر جاری رکھا۔ شام کے قریب ہم جالندھر پہنچے، جہاں منظر بڑا ہی پریشان کن تھا۔ سکھ جارحانہ انداز میں

اپنی تلواریں لہرا رہے تھے اور مسلمانوں پر حملے کے لئے تیار تھے جبکہ خوفزدہ مسلمان اپنی جانیں اور عزت وآبرہ بچانے کے لئے ایک جگہ اکٹھے ہو رہے تھے۔

اگلی صبح ہم نے بہت سے مہاجروں کو جگہ جگہ پہچانے کے لئے اپنا سفر شروع کیا۔ جب ہم پرتارا کیمپ پہنچے جو مسلمانوں کا ایک مہاجر کیمپ تھا تو یہ خبر پہلے ہی پھیل چکی تھی کہ انخلاء کے لیے ایک کانوائے پہنچنے والا ہے۔ سارا کیمپ ہمارے گرد جمع ہو گیا اور فوری انخلاء کے لئے التجائیں کرنے لگا یا پھر کم ازکم بدمعاشوں سے تحفظ کے لیے درخواست کرنے لگا۔ ہمارا آخری پڑاؤ نکودر صرف چند میل دور تھا اور وہ بھی ایک دردانگیز منظر تھا۔ اپنے مسافروں کو بحفاظت اتارنے کے بعد ہم نے اگلے دن واپسی کا سفر شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرے سر میں شدید درد تھا اور میں کیمپ کے باہر ٹہل رہا تھا کہ میں نے ہلکے ہلکے قدموں سے کسی کو اپنی طرف آتے سنا اور پھر ایک نحیف سی آواز میں مجھے کہا گیا کہ اس سے آگے نہ جاؤں کیونکہ سکھ غنڈے دیکھتے ہی گولی ماردیں گے۔ میں رکا تو دیکھا ایک 18 سالہ لڑکی اپنے ہاتھ میں ایک چھوٹی سے پوٹلی لئے کھڑی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا " سلام صاحب جی، مجھے اپنے ساتھ لے چلیں۔" کہاں؟ میں نے پوچھا، پاکستان اس نے جواب دیا میرے خاندان کے تمام افراد کو سکھوں نے قتل کردیا ہے، صرف میں زندہ بچ گئی ہوں اس نے اپنی چھوٹی سی پوٹلی میری طرف بڑھائی جس میں اس کے خاندانی زیورات تھے۔ اس نے کہا اگر اس کے پاس مزید کچھ ہوتا تو وہ بھی مجھے دے دیتی۔ ساری گفتگو کے دوران آنسو اس کے گالوں پر بہتے رہے۔

میں نے اس کی پوٹلی اسے واپس کی اور کہا کہ اسے حفاظت سے اپنے پاس رکھے کیونکہ پاکستان میں ان کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ میں نے اس سے کہا کہ اگلی صبح وہ ہماری روانگی سے پہلے مجھے ملے۔ وہ مایوس دکھائی دے رہی تھی کہ میں نے اس کی پیش کردہ چیزیں نہیں لیں اور پھر وہ کیمپ میں مرتے ہوئے اور نیم مردہ انسانوں کے درمیان غائب ہوگئی۔

ہم صبح سویرے ان مہاجروں کو لے کر روانہ ہوئے جو تحفظ کی تلاش میں پاکستان جانا چاہتے تھے۔ میں سب سے آخر میں کانوائے کے ساتھ روانہ ہوا۔ وہ لڑکی مجھے دور شیشم کے ایک درخت سے ٹیک لگائے دکھائی دی اس نے اپنی پوٹلی دونوں ہاتھوں سے تھام رکھی تھی میں نے اسے اپنے ٹرک کی طرف بلایا اور وہ دوڑتی ہوئی چلی آئی۔ اب اسے یقین تھا کہ وہ اپنی منزل تک پہنچ جائے گی۔

جب ہم امرتسر پہنچے تو بلوچ رجمنٹ کا ایک دستہ وہاں آنے والے مہاجروں کے لئے انتظامات کرنے کی غرض سے متعین تھا۔ جوانوں نے ہر مہاجر کو ایک مٹھی آٹا اور کچھ ایندھن مہیا کیا۔ اس کے بعد عورتوں میں خاصی سرگرمی دکھائی دی وہ اپنے اپنے ٹرکوں سے اتریں اور روٹیاں پکانی شروع کر دیں۔ وہ لڑکی جسے میں نے ہمدردی کی بنا پر ٹرک میں جگہ دی تھی اس نے سب سے پہلے روٹی تیار کر کے مجھے پیش کی۔ یہ احسان مندی کا ایک اظہار تھا۔

ہم شام ہوتے ہوتے واہگہ سرحد پر پہنچے۔ سارے قافلے والے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ آزادی نئی سرزمین پر انہیں خوش آمدید کہہ رہی تھی۔

بی اے چوہدری ——

ہر سال یومِ آزادی بہت دھوم دھام اور جذبے کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ یہ چراغاں کرتے ہوئے شاید ہمیں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اس آزادی کی قیمت کتنے بوڑھے، جوان اور بچوں نے اپنی جانیں قربان کر کے ادا کی ہے اور کتنی معصوم بہنیں اور بیٹیاں تھیں جنہوں نے اپنی عصمت گنوا کر اپنے خون سے یہ دیئے روشن کئے ہیں۔

''دردکا صحرا'' میں ان چند لوگوں کے تاثرات بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اپنے وطن عزیز میں اپنے جلتے ہوئے گھر اور اپنے عزیز و رشتے داروں کی لاشیں چھوڑ کر اس درد کے صحرا کو پار کر کے اپنی منزل تک پہنچ پائے۔ محسن نقوی مرحوم کا ایک شعر ہے۔

شہر جب خوف سے چپ ہو محسنؔ

دل ہے کہ بہت بولتا ہے ......

یہاں آپ دل کو بولتا ہوا سُن رہے ہیں۔